ں بانی

۴

جوشیات پر مشتمل ایک عالمی جریدہ

جوش بانی - ۴

مدیر اعلیٰ

اقبال حیدر

مدیر

علی احمد فاطمی

معاونین

فخر الکریم

صالحہ زرّیں

نعیم السحر

عبد الحی

Josh Bani - 4 (Jan-Jun '10)

Published by : Josh Literary Society (India - Canada)

Price : Rs. 50.00 (India)
Rs. 100.00 (Pakistan)

جوش بانی۔ ۳ جنوری تا جون ۱۰ء

کتابت : شارپ ٹریک کمپیوٹرز، الہ آباد(shadabmz@rediffmail.com)

طباعت : سٹی آفسیٹ پریس، الہ آباد

سرورق : شاداب مسیح الزماں

قیمت : ۵۰ روپے (ہندوستان)، ۱۰۰ روپے (پاکستان)

پتہ : ۶۸، مرزا غالب روڈ، الہ آباد، انڈیا

+9415306239 (انڈیا) +(403) 2410834 (کینیڈا)

==========**زیر اہتمام**==========

جوش لٹریری سوسائٹی، انڈیا، کینیڈا

فہرست

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو مرغ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

اداریــــــــہ:

''ہر طرف آدمی کا شکار آدمی''

''جوش بانی'' جب جاری کیا گیا تھا اُس وقت بہ زبان قمر رئیس مرحوم اور اقبال حیدر، یہ بات واضح طور پر کہی گئی تھی کہ اِس اجراء کا مقصد جوش جیسے انقلابی و احتجاجی شاعر یا روایتی ترقی پسندی کا بے مقصد پروپگنڈا نہیں ہے بلکہ جوش کے توسط سے اس انسان دوستی اور تعقل پسندی پر زور ہے جو اس زمانے میں اپنی تمام تر سائنسی ترقیوں کے باوجود اسی ترقی اور تبدیلی کی بھیڑ میں گم ہوگئی ہے۔ ترقی کے نام پر انسان اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہے۔ جنگ زرگری میں گھر گیا ہے۔ صارفیت یا عالم کاریت کے ایسے بھنور میں پھنس گیا ہے جہاں سے نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ یہ گھبراؤ صرف سائنسی یا معاشی ترقی کے نام پر نہیں ہے بلکہ مذہب اور سیاست کے نام پر بھی ہے۔ اسی شور و غل اور بھیڑ بھاڑ میں وہ اپنی انسانی اور اخلاقی قدریں فراموش کرتا جا رہا ہے۔ اپنی بشری عظمت یا آدمیت کھوتا جا رہا ہے۔ کبھی جوش نے کہا تھا:

دہر کو جن قوتوں پر ناز ہے
سب ہیں گونگی آدمی آواز ہے
آدمی قندیل، محرابِ شعور
آدمی آئینہ، پتھر، کوہِ طور

اسی آدمی کے بارے میں ندا فاضلی یہ کہتے ہیں:

ہر طرف دوڑتے، بھاگتے راستے
ہر طرف آدمی کا شکار آدمی

جوش نے پاسِ بشریت اور احترام آدمیت پر خاصی روشنائی خرچ کی۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے ایسا پہلی بار کیا، اس سے قبل نظیر، میر، غالب، اقبال وغیرہ نے عظمت انسانی پر خوب تخلیق کی لیکن وہی آدمی آج دنیا کی بھیڑ میں گم ہوگیا ہے۔ اسی کی تلاش، انھیں انسانی قدروں کی تلاش آج کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ دیکھئے وہی انسان تلاش کے کیا کیا راستے نکالتا ہے۔

گذشتہ برس (اگست ۲۰۰۹ء) جوش لٹریری سوسائٹی کینڈا نے کیلگری میں سہ روزہ عالمی جوش سمینار کا اہتمام کیا۔ یوں تو سمینار روایتی انداز سے ہوتے ہی رہتے ہیں اور اردو کے سمینار تو آج بھی روایتی اور فرسودہ قسم کے ہوتے ہیں لیکن ممتاز جوش شناس، شاعر اور دانشور اقبال حیدر (صدر جوش لٹریری سوسائٹی) نے یہ سمینار بالکل نئے ڈھنگ سے کیا۔ اِس سمینار میں انھوں نے سائنس دانوں، وکیلوں اور دوسرے ڈسپلن کے ماہرین اور دانشوران کو مدعو کیا اور جوش کے علاوہ اردو تہذیب، مذہبی تشخص، وحدتِ انسانی وغیرہ کے موضوعات پر انگریزی میں مقالے پڑھے گئے اور آج کی ترقی اور ایجادات کی بھیڑ میں وحدتِ انسانی کے کیا معیار اور تصورات ہوسکتے ہیں۔ ان پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ سمینار کیلگری یونیورسٹی میں ہوا جس میں اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بھی شرکت کی۔ نئی نسل کے لوگوں نے شرکت کی اور ثقافتی پروگرام پیش کئے۔ (ملاحظہ کیجئے تفصیلی رپورٹ جو اِسی شمارہ میں شامل ہے۔)

ادارۂ جوش بانی اقبال حیدر کو اس کامیاب اور انوکھے سمینار کے انعقاد کے لئے مبارک باد پیش کرتا ہے کہ انھوں نے ایک نئے ڈھنگ سے سمینار منعقد کیا اور آج کی عالمی سوچ کو جوش کی انسانی سوچ سے مدغم کر کے فکر و خیال کی نئی سے نئی راہ نکالنے کی کامیاب کوشش کی۔ ہندو پاک کی

اردو دنیا میں مشاعروں کی طرح سمینار بھی ہونے لگے ہیں اور مشاعروں کی ہی طرح سمیناروں میں بھی جو ایک خاص قسم کا پروفیشنلزم آ گیا ہے، اُنھیں اِس سمینار سے روشنی حاصل کرنا چاہئے کہ اردو مذاکروں، سمیناروں کا فکری کارواں اسی انداز سے آگے بڑھنا چاہئے۔

اِس شمارے میں دو ایک ابتدائی مضامین کو چھوڑ کر باقی سارے مضامین نئے ہیں اور خود سے لکھے گئے ہیں اور جوش بانی کے لئے خصوصی طور پر عنایت کردہ ہیں۔ میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خاص طور پر ڈاکٹر نعیم السحر صدیقی کا کہ جو نئی نسل میں ایک معقول جوش شناس کے طور پر اُبھر رہی ہیں اور جن کی کتاب ''جوش کی شاعری کا فکری اور سماجی مطالعہ'' حال میں منظرِ عام پر آئی ہے جو ایک نئے جوش کو متعارف کراتی ہے۔

خصوصی گوشہ بھی خاصا معنی خیز ہے اور بے حد معلومات فراہم کرتا ہے۔ میں پروفیسر محمود الحسن رضوی، غلام نبی خیال اور نذیر فتح پوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان سب نے ہماری خصوصی درخواست پر یہ مضامین قلم بند کئے جن سے جوش کی جدوجہد سے بھری زندگی کے مختلف گوشوں پر دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ داؤد اشرف کے مضمون کے لئے میں اپنے دوست پروفیسر بیگ احساس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کے توسط سے یہ عمدہ مضمون ہمیں مل سکا۔ ہم نے کراچی کے ماہر جوشیات ڈاکٹر ہلال نقوی سے بھی گذارش کی تھی کہ وہ ''جوش اور کراچی'' کے عنوان سے مضمون لکھیں تاکہ یہ گوشہ مکمل ہو سکے لیکن اُنھیں لگا کہ اِس عنوان سے جو مضمون ہوگا وہ تکلیف دہ اور اذیت ناک زیادہ ہوگا کہ جوش نے خود کہا تھا:

''یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے مقتل میں حسین''

بہر حال مضمون نہ ہو سکا لیکن ہمارا اب بھی اصرار ہے کہ وہ اِس موضوع پر ضرور لکھیں کہ اس پر اُن سے بہتر کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔

''جوش بانی'' کا یہ شمارہ قدرے تاخیر سے شائع ہو سکا۔ قمر رئیس کی رحلت نے بہت

کچھ بکھیر دیا ہے۔ انھیں پھر سے سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ راقم کی ذاتی مصروفیات، دوستوں کی عنایات بھی آڑے آئیں ____ بہر حال چوتھا شمارہ حاضر خدمت ہے۔ ''جوش بانی'' کے جاری رہنے میں تمام جوش پسندوں، عقل پرستوں اور انسان دوستوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ جلد ہی یہ رسالہ اپنی شکل وصورت بدلے گا کہ جس طرح سے اقبال حیدر نے بدلے ہوئے انداز میں سمینار کیا ہے۔ ''جوش بانی'' کو بھی بدلنے میں وہ تعاون کریں گے۔ اِس کا مجھے یقین ہے۔

علی احمد فاطمی

مضامین:

جوشؔ کی یاد میں

شمیم حنفی

اقبالؔ کے بارے میں فراقؔ صاحب کا خیال تھا کہ ان کا لہجہ اپنی ''درشتگی اور اکھڑ پن'' کی وجہ سے ہندوستانی ادبیات کے بعض صالح عناصر (مثلاً گھلاوٹ، نرمی، چمکار) کی نفی کرتا ہے، اس کے برعکس جوشؔ کے بنیادی اسلوب کو فراقؔ صاحب نے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ متعدد موقعوں پر فراقؔ صاحب نے جوشؔ کو اردو کے معاصر ادبی معاشرے کی اہم ترین شخصیت سے تعبیر کیا ہے۔ اس انداز نظر کے سبب فراقؔ صاحب کی سخن فہمی سے زیادہ اقبالؔ کے سلسلے میں ان کے بعض تعصبات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جوشؔ کی شاعری فکری سطح پر، اُس نوع کی حدیں قائم نہیں کرتی جو بالعموم اقبالؔ سے منسوب کی جاتی ہیں۔

ایک کے اثبات کے لیے دوسرے سے انکار یہاں بظاہر غیر ضروری تھا کہ اقبالؔ اور جوشؔ دونوں کی دنیائیں، مماثلت کے چند بیّن پہلوؤں کے باوجود ایک دوسرے سے کلیتاً مختلف تھیں۔ اس اختلاف کی بنیاد اقبالؔ اور جوشؔ کے اسالیب اظہار بھی ہیں اور ہمارے زمانے کے فرونیز اس کی اجتماعی کائنات کے رویّے بھی۔ جس طرح فیضؔ کی شاعرانہ حیثیت کے تعین کے لیے، جوشؔ سے ان کا موازنہ دوراز کار ہے، اسی طرح جوشؔ کی تقویم انھیں اقبالؔ کے حوالے سے سمجھنے کی محتاج نہیں ٹھہراتی۔ اشتراک کا صرف یہ عنصر کہ اقبالؔ اور جوشؔ کے فکری منطقوں کی اساس بیسویں صدی کے سیاسی، سماجی اور تاریخی حقائق پر قائم ہے، اپنی صراحت کے باوجود، جوشؔ کی

اہمیت اور مرتبے کی شناخت میں ہمارے لیے زیادہ کارآمد نہیں ہوسکتی۔ اپنے عہد کی صورت حال اور عام انسانی مسائل کی طرف دونوں کے زاویے مختلف تھے، دونوں کا تصور تاریخ ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں متضاد بھی تھا۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دونوں کی تخلیقی طینت کے عناصر ترکیبی جدا جدا تھے۔ اقبالؔ کی شاعری کا مجموعی مزاج انکی مشرقیت کے باوجود ان کی مغرب شناسی کا مرہون منت تھا، چنانچہ ان کی شعر کی خارجی ہیئت اپنی روایت کا عطیہ ہوتے ہوئے بھی اپنی داخلی بُنت اور ساخت کے لحاظ سے مغربی ہے اور مشرقی ادب کے مشاہیر سے زیادہ ہمیں مغربی زبانوں کے اُن شعراء کی یاد دلاتی ہے جنھوں نے فکری شاعری کو ایک نیا مزاج اور معیار عطا کیا۔ رومیؔ اور حافظ اقبالؔ کے تجربوں کا اجتماعی پس منظر فراہم کرتے ہیں، اِن تجربوں کی تعبیر و تفہیم کے لیے ہمیں بہر حال مغربی فکر اور ادب کے بعض جلیل القدر ترجمانوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ شعر کی ماہیت اور حقیقت، نیز عمل و ردعمل کی وہ صورتیں جو مغربی اساتذہ کے حوالے سے سامنے آئیں، انہی میں ہمیں اقبالؔ کی فنی سرشت اور امتیازات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ شاید اسی لیے بیسویں صدی کی وجودی فکر، اور اس کے واسطے سے صنعتی تمدن اور سائنسی عقلیت کے تئیں مغرب کے نئے، پیچیدہ اور تناؤ کی ایک مستقل کیفیت سے دوچار انسان کے تجربوں کی گشت بھی ہمیں اقبالؔ کی شاعری میں صاف سنائی دیتی ہے۔ یہ انسان صرف مغربی تہذیب کے تصادمات کا مظہر نہیں بلکہ عہدِ حاضر کا انسان ہے جس کی تشکیل پندرہویں صدی اور سولہویں صدی کی مغربی نشاۃ ثانیہ کے ہاتھوں ہوئی اور جو بالآخر پہلی جنگ عظیم کے بعد کا آپ اپنے سے گریباں گیر آفاقی انسان بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس انسان کی صورت گری میں اقبالؔ نے اپنی مخصوص تاریخ اور روایت کے حوالوں سے مدد لی ہے لیکن اس کی مشرقیت محض ایک التباس ہے اور اسکی نوعیت اس نئے انسان کی ''مشرفیت'' سے مختلف نہیں جسے لارنس نے مغرب کی نجات کا وسیلہ قرار دیا تھا۔ اس پس منظر میں مشرقیت کا مفہوم جغرافیائی نہیں بلکہ ایک نئے تہذیبی، جذباتی اور نفسیاتی تناظر سے مشروط ہے۔

جوشؔ کا ذہن اپنے حدود اور اپنے حاضر کے جبر کی وجہ سے نہ تو مشرق و مغرب کی اس

تعبیر کا متحمل ہو سکتا ہے جس کے نشانات اقبالؔ کی شاعری اور افکار میں ملتے ہیں، نہ ہی اس کی شعری حسیت اور کردار کی تعمیر میں وہ قوتیں سرگرم ہو سکیں جن کا منظر نامہ شعر و ادب کے عالمی اور آفاقی معیاروں نے ترتیب دیا تھا اور جن تک قبالؔ کی رسائی مغربی ادبیات اور افکار کے واسطوں سے ہوئی تھی۔ اقبالؔ کی شاعری میں لہجے کا مفکرانہ جلال اسی لیے جوشؔ کی خطیبانہ بلند آہنگی سے الگ ایک بہت مختلف اور وسیع اور پر پیچ فکری کائنات سے وابستگی کی خبر دیتا ہے۔ اقبالؔ جذبے اور آگہی کی دوئی کو مٹاتے ہیں اور اسے ایک نئی ہمہ گیر بصیرت کا بدل ٹھہرا تے ہیں جب کہ جوشؔ کا جذبۂ آسودگی دراصل انکے افکار کی سطحیت اور بصیرت کے فقر کا حجاب بن کر اُبھرتا ہے اور اپنے قاری سے جذبے ہی کی سطح پر تعلق استوار کرتا ہے فکر کے شکوہ اور اس کے طمطراق کی راہیں متوازی نہیں ہوتیں کہ ایک کا حرف آغاز قلندرانہ جذب وسکوت ہے، دوسری کا فکری تشنج اور اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا جذباتی اشتعال و ہیجان۔ یہ امر محض اتفاقی نہیں کہ جوشؔ شعر کے معنی کی دوٹوک اور براہ راست ترسیل کے قائل تھے اور جوشؔ کے برعکس اقبالؔ نے شعر کو اُس حرفِ تمنا کا مترادف قرار دیا تھا جس کی حقیقت ابہام واسرار کے ایک ناگزیر عنصر کی تابع ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے اپنی غزل کو آتشِ رفتہ کے سراغ کا ذریعہ بتایا تھا کہ رفت وبود کے اسی آئینے میں آئندہ کے ادراک کا رمز بھی مضمر ہے جب کہ جوشؔ کی مستقبل بینی رفتگاں کے تجربے سے کوئی بھی علاقہ رکھنے پر آمادہ نہیں تھی۔ ایک کے لیے ماضی، حال اور مستقبل ایک بسیط سچائی کے قطعے تھے، دوسرے کے لیے ماضی حرف گزشتہ کا ہم معنی وہم راز تھا۔

تصورات کی شاعری اقبالؔ اور جوشؔ دونوں کا نشان امتیاز ہے لیکن دونوں کے تصورات کی نوعیتیں اس درجہ مختلف ہیں کہ انکے فنی تبدل کا عمل اور ردعمل یا حاصل ایک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ کہنا جوشؔ کے ساتھ زیادتی ہوگی کہ تصورات ان پر تجربوں کی صورت میں وارد نہیں ہو سکے۔ اپنی مجرو سطح پر تصورات کی حیثیت ایسے خالی خولی ذہنی تجربوں کی ہوتی ہے جو بڑی شاعری تو کیا اچھی شاعری کا خام مواد بھی نہیں بن سکتے۔ چنانچہ شعری وسائل کا ستعمال اقبالؔ کی طرح جوشؔ کے کلام میں بھی وافر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم جوشؔ کے تصورات میں یک سمتی اور عمومیت کا جو ماحول ملتا ہے

اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے دائرے اور حدود متعین ہیں، جذباتیت کے باوجود منطق اور تعمیر (Constructive) ہیں۔ تخلیقیت کے اوصاف بالعموم اس میں اس لیے نہ پیدا ہو سکے کہ ان کا ارتقا ہمیشہ واضح خطوط پر ہوتا ہے اور ایک مانوس استدلال ان کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ ان میں اپنی وقت اور مقام کی بساط سے ارتفاع کی کیفیتیں خال خال ہی نمودار ہوئی ہیں۔ یہ شاعری حواس سے زیادہ ایک جذباتی ذہن کی بیداری کا پتہ دیتی ہے اور اپنے مقررہ مقاصد نیز طے شدہ منہاج سے سرمو اختلاف کو روا نہیں رکھتی۔ گردوپیش کی دنیا کا خارجی پیکر اس کے لیے اتنی بڑی حقیقت ہے کہ اس کی تہہ میں اسے کسی بعید تر سچائی کا بھید نہیں ملتا اور اس کے واسطے سے کوئی ازلی وابدی رمز نہیں کھلتا۔ یہ آشوب ایک سیدھی سادی باخبری کا ہے جو تخلیقی جذب اور گم شدگی کے رازوں سے ناواقف ہے اور اس کی پُراسرار توانائیوں سے کام لینا نہیں جانتی۔

یہاں ایک واقعے کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ روایت ہے کہ جوشؔ نے آئن سٹائن کے مسئلہ اضافیت کی بابت اپنے ایک دوست سے کچھ وضاحتیں طلب کیں۔ اس استفسار پر کہ یہ تلاش مقصود کیوں ہے جوشؔ نے جواب دیا کہ وہ نظریہ اضافیت کو نظم کرنا چاہتے ہیں، اگر ایک طرف یہ واقعہ اپنے وقت کے ساتھ چلنے کی خواہش کا اشاریہ ہے تو دوسری طرف اس سے جوشؔ کے شعری طریقِ کار پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رفاقت میں بیان کی شاعری بیان ہی کی شاعری رہے گی، شعری بیان نہ بن سکے گی کہ اس کی اوّلین شرط تجربے کا تخلیقی ہونا ہے۔ یہ باتیں میں اعتراض کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں، نہ ہی انکا مقصد جوشؔ کے شاعرانہ مرتبے کی تخفیف ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ جوشؔ کو سمجھنے کے لیئے جس تناظر کی ضرورت ہے اُس کی تلاش سے زیادہ، جوشؔ کے مداحوں نے سروکار اقبالؔ اور جوشؔ کے موازنے سے رکھا اور یہ حقیقت فراموش کردی کہ دونوں میں زمانہ مشترک سہی، مگر زمانے کی طرف اُن کی نظر کے زاویے دو مختلف تخلیقی طبائع کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دونوں کے فکری سرچشمے، تخلیقی تفاعل کے میدان اور اپنے تجربوں کے اظہار و انکشاف سے وابستہ مقاصد الگ الگ ہیں۔ بعض حضرات نے جوشؔ کے مطالعے میں اقبال سے اُن کے مقابلے کو اس لیے ناگزیر سمجھا کہ بیسویں صدی کے ادبی منظرنامے پر اقبالؔ کی نظم گوئی نے

جو نقش ترتیب دیے نقش کا قیام بظاہر دشوار دکھائی دیتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دراصل اسی جبر سے جوش کے تخلیقی اختیارات کا راستہ نکلتا ہے اور یہ واقعہ، بجائے خود، کم اہم نہیں کہ اقبال کے باوجود جوش کی نظم گوئی کا ظہور اس منظرنامے پر ایک علاحدہ روایت کے حرف آغاز کی صورت ہوا۔ یہ روایت ایک نئی سماجی، سیاسی اور جذباتی ضرورت کے تابع تھی۔ اور اس کی تشکیل وحصول کے راستے میں سب سے بھاری پتھر، اقبال کے آخری دور میں ابھرنے والے نئے نظم گویوں کے لیے، خود اقبال کی شاعری تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ نئے معیاروں کا جو غلغلہ بلند ہوا، اس میں ادب کے نئے نظریہ سازوں کے ہاتھوں اقبال کی شاعری اعتراض وملامت کا ایسا ہدف نہ بنتی۔ ان تمام معترضین کی گمراہی کا سبب یہ حقیقت تھی کہ اوّل اوّل انہوں نے اقبال اور جوش دونوں کی شاعری کے محض مادّی اور بیرونی حوالوں، نیز اس کی خارجی پرت کو پیشِ نظر رکھا۔ نتیجتاً اقبال احیاء پرست نظر آئے، جوش ترقی پسند، اقبال عوام دشمن دکھائی دیے اور جوش ایک عوام دوست انقلابی، اقبال کی شاعری جاگیردارانہ اقدار کی امین محسوس ہوئی اور جوش کی شاعری ایک نئی عقلیت کی ترجمان۔ مگر بالآخر ان معترضین کے موقف میں جو تبدیلی پیدا ہوئی (جس کی روشن مثال ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور سردار جعفری ہیں) اس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی شاعری جوش کے مقابلے میں بہر حال ذرا دیر سے اور دور سے سمجھ میں آنے والی چیز تھی۔ ایسا نہیں کہ اقبال کی شاعری فکری عجلت پسندی اور فوری مقاصد کے آسیب سے یکسر آزاد تھی یا یہ کہ اُن کے مشن میں رجعت زدگی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں اپنے فکری تناقصات کے باوجود وہ تخلیقی توانائی شروع ہی سے موجود تھی جو قاری کے تعصبات کو مسمار کرتی ہے۔ چنانچہ اقبال کی شاعری نے اپنی فکر کے منکروں سے خراج اقبال کی زندگی میں بھی وصول کیا تھا، آج بھی وصول کر رہی ہے۔ اور اپنے انتقال سے پہلے فراق صاحب نے بھی ایک سے زیادہ موقعوں پر یہ اعتراف کیا کہ اردو کی شعری روایت میں عظمت وفضیلت کی دستار کا حق میرؔ وغالب کے بعد اقبال ہی کو پہنچتا ہے۔

جوش کی شاعرانہ حیثیت، اقبال کے اس اعتراف سے کم نہیں ہوئی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ

اس اعتراف کے بعد ہی مستحکم ہوئی ہے۔ اور تو اور، خود اقبال نے بھی جوش کے شاعرانہ جوہر کی داد دی تھی اور روحِ ادب کی اشاعت (۱۹۲۰ء) کو اردو شاعری کے ایک اہم واقعے سے تعبیر کیا تھا۔ اقبال نے بیان کی شاعری، تعہد کی شاعری اور ایک واضح تاریخی وسماجی سیاق رکھنے والی شاعری کو جو اعتبار بخشا تھا اُس کے پیشِ نظر انہیں خطوط پر چلنے والے کسی شاعر کا چراغ جلنا آسان نہ تھا۔ جوش کے ابتدائی مجموعوں (روح ادب شاعر کی رائیں، نقش ونگار، اور شعلہ وشبنم) میں ان کے سیاسی اور سماجی افکار کی لے بہت اونچی نہیں ہے۔ اکثریت رومانی او منظریہ نظموں کی ہے اور تاریخ سے وابستگی کے نشانات بہت مبہم ہیں۔ ان میں ایک ایسے ذہن کی تصویر ابھرتی ہے جو حُسن کا شیدائی ہے اور تمام نامطبوع مناظر اور مظاہر سے آنکھیں بچاتا ہوا، اپنے شاعرانہ احساس کا رشتہ انہی منطقوں سے مربوط کرتا ہے جو نرم آثار اور لطیف ہیں۔ چنانچہ ایک عرصے تک یہ خیال عام رہا ہے کہ جوش اپنے ہیجانات کی تہذیب کے بجائے اپنے رومان پرور جذبات کے بے کم وکاست اظہار پر قانع ہیں اور یہ کہ اُن کے تجربات کی دنیا محدود بھی ہے اور ایک حد تک غیر حقیقی بھی اس وقت تک حقیقت کا سب سے تابناک استعارہ اقبال کی شاعری تھی جس کے ذہنی انسلاکات ہر چند کہ غیر ارضی اور مابعد الطبیعاتی تھے، لیکن جس کا سیاق بیسویں صدی کی تاریخ اور اس کے پروردہ تہذیبی ماحول نے فراہم کیا تھا۔ غیر ترقی پسند حلقوں میں جوش کی حیثیت بس ایک شاعر سباب کی تھی جو فطرت کے مظاہر اور اپنی امنگوں میں گم ہے۔ ترقی پسند تحریک اپنے ابتدائی دور میں جس ادعائیت اور جذباتی انتہا پسندی کا شکار تھی اس کی ضرورتوں کے پیش نظر اقبال اپنی مذہبیت کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اقبال کی نفی سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے لیے کم وبیش اُسی قد وقامت کا التباس قائم کرنے والی کسی شخصیت کا وجود اپنے مشن کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری تھا۔ جوش کے رویے مختلف اور محدود تھے مگر ان کی قادر الکامی، ان کا تحکم آمیز پر اعتماد لہجہ اور اُن کی نشاطیہ لے نے اُن کی شاعری کو اقبال سے الگ، بلکہ متضد، ایک نئی شعری قدر کی حیثیت دے دی تھی۔ پھر جوش داخلی تجربوں کی سب سے سرگرم اور متقدر صنف سخن غزل کے مخالف تھے اور اس غریب کو ہمارے بزرگ ترقی پسندوں نے بھی اپنی اثباتیت اور تعمیر پسندی کے

جوش میں ناکارہ قرار دے دیا تھا۔

مقصدی شاعری کی روایت سے اقبالؔ کو منہا کرنے کے بعد ترقی پسند تحریک نے جوشؔ کے لیے ایک نئی زمین ہموار کردی تھی۔ یہ تحریک بلاشبہ ہماری ادبی تاریخ کی سب سے بڑی تحریک تھی جس کے بغیر ہماری ادبی روایت ہرگز وہ کچھ نہیں ہوسکتی تھی۔ جیسی کہ آج ہے ایک نئے روحانی مطالبے اور جمالیاتی ضرورت نے اس عظیم الشان تحریک کے لیے راستہ صاف کیا تھا۔ چنانچہ جوشؔ کا شاعرانہ کمال بجائے خود اس تحریک کے تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا۔ تحریک سے باضابطہ منسلک شعراء میں فیضؔ اور مخدومؔ جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتبار سے زیادہ خود مختار اور اپنے رفقاء کی بہ نسبت کہیں زیادہ مستحکم بنیادیں رکھتے تھے ان کی شاعری پر جوشؔ کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ واقعہ محض اتفاقی نہیں کہ فیضؔ نے اقبالؔ کا قصیدہ نما مرثیہ لکھا جب کہ ان کے بیشتر معاصرین اقبالؔ بہ نام جوشؔ کے قضیے میں الجھے ہوئے تھے اور ہر قیمت پر اقبالؔ کو رجعت پسند اور جوشؔ کو ترقی پسند ثابت کرنے کے درپے تھے۔ اقبالؔ کی شاعری کے سلسلے میں جوشؔ نے جن تحفظات کا اظہار کیا ہے اُن کی ذمے داری جوشؔ کے معصوم اور سرگرم مداحوں کے سر جاتی ہے جنھوں نے خواہ مخواہ جوشؔ کو اقبالؔ کے مقابلے میں لا کھڑا کیا تھا اور اقبالؔ کی نفی میں جوش کے اثبات کی بنیادیں تلاش کر رہے تھے۔

پھر ایک معاملے میں جوشؔ کو اقبالؔ پر یقیناً برتری حاصل تھی۔ وہ اسے اظہار میں طنز کی کاٹ، للکار اور خطیبانہ استدلال۔ انیسؔ کے بعد اظہار کی اس قوت کے معاملے میں جوشؔ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ اُس عہد کے قومی اور بین الاقوامی ماحول اور سیاسی وسماجی صورت حالات کے پیش نظر قبولیت عام کے لیے اظہار کی یہ قوت ایک زبردست آلہ کار تھی۔ ناصر کاظمی نے ایک بار اس سلسلے میں ہی یہ فقرہ لگایا تھا کہ ''جوشؔ صاحب تھری ناٹ تھری سے پدّی کا شکار کرتے ہیں۔'' لیکن اس میں شک نہیں کہ جوش کی گھن گرج، لفظیات کی بے حساب آبادی جو تمام کی تمام جوشؔ کے لسانی اقتدار کی مطیع تھی اور ان کا خلقی احساسِ برتری جس سے جوشؔ کے بے مثال طنز کی راہ نکلتی ہے۔ جدید اردو نظم کے لیے وسائل اور توانائیوں کا ایک نیا مخزن تھی۔ میرا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک

نے جوش سے جو کچھ بھی پایا اس کے سلسلے میں تو دو رائیں ہو سکتی ہیں، مگر جوش کو خود اس تحریک نے قبولیت اور امتیاز کی جو سہولتیں مہیا کیں وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کے فنی وسائل، سمتوں کے اختلاف اور فرق کے باوجود، ایک حد تک وہی ہیں جنھیں عام طور پر انیسؔ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ انیسؔ کی شاعری، اپنی تمام تر برگزیدگی کے باوجوع عمومی تجربوں اور مجلسی تقاضوں سے بندھی ہوئی شاعری ہے، جو اِکّا دُکّا مستثنیات سے قطع نظر، ہر موڑ پر اپنے مخاطب کے وجود کا احساس دلاتی ہے اس لیے اُس کی لَے اونچی بھی ہے اور غیر مبہم بھی۔ انیسؔ ہی کی طرح جوشؔ کے کلام میں بھی خود کلامی کی مثالیں بہت کم ہیں اور ایک رنگ کے مضمون کو سو طرح سے باندھنے کا چلن بھی جوشؔ نے انیسؔ اور انیس کے واسطے سے عربی اور فارسی شاعری کی عام روایت سے سیکھا ہے۔ اس نوع کی قدرت کمال کا اظہار امراء القیس نے ان لفظوں میں کیا تھا کہ ''میں آئے ہوئے قافیوں کو یوں ہٹاتا اور دور کرتا ہوں جیسے کوئی شریر چھوکرا ٹڈی دل کو مار مار کر ہٹاتا ہو''۔ قافیہ پیمائی کے معاملہ میں جوشؔ کا رویہ انتخاب سے زیادہ ایک نیم شعور یا وہ نیم ارادی ایجاب کا ہے، چنانچہ ان کی اکثر نظموں میں تجربے یا فکر کے ارتقا سے زیادہ ایک محور سے چمٹے ہوئے اظہار کی ہمہ دائرہ تصویریں ابھرتی ہیں۔ غزل سے جوشؔ کے اجتناب کا سبب بھی تجربے کے تکرار آمیز بیان کی یہی عادت ہے۔ یہ عادت جوشؔ کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ ہر اختیار عادت میں منتقل ہونے کے بعد اسی نوع کی مجوری بن جاتا ہے۔

گرچہ اس تکرار کی نوعیت جوشؔ کے یہاں کہیں کہیں ایسی ہے گویا کہ ایک جفاکش استاد غبی طلباء کو ریاضی کا فارمولا یاد کرا رہا ہے یا طلباء کی بصیرت کے تئیں ایک مربیانہ بے اعتمادی کے سبب مشق کا کوئی پہلو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے، مگر یہ واقعہ بھی ہے کہ جوشؔ کا یہ رویہ کسی نہ کسی حد تک اردو کی شعری روایت پر سایہ فگن اسالیب سے ایک غیر شعوری شغف کا زائیدہ بھی ہے۔ اقبالؔ اس سے یوں بچ نکلے کہ ایک تو کہنے کے لیے ان کے پاس باتیں بہت تھیں، دوسرے یہ کہ انہوں نے فکری شاعری کے اعلیٰ ترین نمونوں سے بھی بہت کچھ سیکھا تھا اور تخلیقی لفظ کے اختیار کے ساتھ

ساتھ مانوس اسالیب کے جبر کا شعور بھی رکھتے تھے۔

جوشؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ اپنی لسانی عادتوں اور مجبوریوں کو ترک کیے بغیر، اور اس واقعے کے بغیر کہ عالمی ادبیات سے ان کی شناسائی کی کوئی شہادت ہمیں ان کی نثر و نظم میں نہیں ملتی اُن کی شاعری اپنا ایک الگ چہرہ رکھتی ہے، جوشؔ سے پہلے یہ امتیاز انیسؔ کا تھا، مگر دونوں کا کائنات مختلف ہے، اور جوشؔ کے بعد بھی ان کے شیدائیوں میں کوئی اس معاملے میں ان کے مقابل نہ ٹھہر سکا۔ جوشؔ کی شاعری اگر کسی بڑی استعاراتی سطح کی حامل نہ ہوسکی تو وہ بھی اس وجہ سے کہ ایک تو اردو میں باقاعدہ استعاراتی نظام رکھنے والے شعراء کی تعداد، کم از کم جوشؔ سے پہلے، گنتی کی تھی دوسرے یہ کہ ہماری روایت میں اکثر استعارے بھی کثرتِ استعمال کے سبب متاعِ عام بن گئے، ایسے استعاروں کو، صرف اس لیے کہ وہ استعارے ہیں، خوبصورت اور تازہ کار تشبیہوں پر فوقیت دینا ایک طرح کی بدتوفیقی ہے۔ اس بدتوفیقی کا رواج مغربی شعریات کے اصولوں کی مقبولیت کے سبب فی زمانہ ہمارے یہاں بھی بہت عام ہوتا جارہا ہے اور ہم نے یہ بات سرے سے بھلا دی ہے کہ اردو سے قطع نظر عربی اور فارسی کی شعری روایت میں بھی تشبیہی عمل مشرقی شاعری کے ایک امتیاز کا حکم رکھتا ہے۔ جوشؔ کی شاعری میں تشبیہی تخیل کی مثالیں کثیر ہیں اور اس تخیل نے حرکی اور غیر حرکی ہر دونوں قسم کے پکیر خلق کیے ہیں۔

ہماری شاعری کے تمام اسالیب میں قصیدے کا پر شکوہ، معنی آفریں اور گراں قدر اسلوب ایک بنیادی اسلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اظہار کی آزادی اور تجربے کی خودسری نے اس اسلوب کو نت نئی شکلیں دیں۔ جوشؔ ایک بڑے شاعر بھی تھے اور اپنے مزاج کے اعتبار سے انقلابی بھی، مگر جس طرح ان کی انقلاب پسندی انکی اشرافی رومانیت کے حصار سے باہر نہ جاسکی، اسی طرح جوشؔ کی آزادیاں بھی اپنی مخصوص پابندی رکھتی ہیں۔ اسی لیے، شروع ہی میں میں نے یہ بات عرض کی تھی کہ جوشؔ اپنے اظہار و اسلوب اور فنی رویوں کے معاملے میں اصلاً مشرقی ہیں اور اقبال اپنی تمام تر عقلیت بیزاری' اور مشرقیت کے باوجود مغربی۔ چنانچہ جوشؔ کی شاعری جمالیات کے متغیر میلانات کا بار اٹھا سکے گی اور ہماری آئندہ روایت میں کسی زندہ معنویت کا تحفظ کر سکے گی یا

نہیں، اس سوال کا جواب ہمیں فن کے نئے معیاروں کے بجائے خود جوشؔ کی شاعری میں تلاش کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ یہ شاعری ہماری تاریخ کا ایک مستقل اور محفوظ سرمایہ ہے، وقیع اور دل چسپ، مگر روایت بہرنوع تاریخ سے زیادہ سرکش اور تیز رفتار ہوتی ہے۔

جوشؔ کی شاعری ایک نئی روایت کا حرفِ آغاز بھی تھی اور اس کا اختتامیہ بھی اس نے ہمیں بشارتیں بھی دیں اور بے چینیاں بھی۔ اس نے کسی بڑے فکری اجتہاد سے زیادہ ایک نیم فکری اور جذباتی بغاوت کا رول اور دانشوری کی اُس روایت سے کسی نہ کسی سطح پر خود کو مربوط رکھا جس کی داغ بیل سائنسی عقلیت نے ڈالی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جوشؔ ہماری بعض تہذیبی اور سماجی ایقانات کو ایک ایسی زبان دی جو پرانی ہوتے ہوئے بھی نئی تھی اور جس کا دروازہ جوشؔ کے ساتھ شاید، ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔ جس کی شاعری کا وہ حصّہ جس پر نسبتاً کم توجہ دی گئی مثلاً ان کے ایسے اشعار جن میں سیاسی اور سماجی طنز کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں، یا پھر اُن کی منظریہ نظمیں جن میں اشیاء، مظاہر اور موجودات اپنی عنصری سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ ہم سے کلام کرتے ہیں، میرے خیال میں ایک نئے تجزیے کا طالب ہے کہ بہ طور شاعر، اسی میں جوشؔ کی ہمیشگی کا رمز چھپا ہوا ہے:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆

جوشؔ کا تصوّرِ شاعری

وارث علوی

جوشؔ ہماری کلاسیکی شعری روایت کے آخری بڑے نظم گو شاعر تھے۔ ان کی شاعرانہ عظمت نے ایک زمانہ سے اپنا لوہا منوایا لیکن یہ عظمت جن شعری صفات اور فنی عناصر سے تشکیل پائی تھی انکی طرف ہمارا تنقیدی رویہ مذاقِ سخن کی تبدیلی کے سبب تشکک کا شکار ہوتا گیا اور ہمیں یہ فیصلہ کرنے مین دُشواریاں پیش آتی رہیں کہ جوشؔ کی شاعری کی ناقدانہ تحسین کا صائب طریقہ کونسا ہے۔ یہ تشکک نوعیت کے اعتبار سے وہی ہے جس کا اظہار ملٹن کے متعلق اس جملہ میں ہوتا ہے کہ ملٹن عظیم شاعر ہے کیونکہ اسے کوئی نہیں پڑھتا۔ شاعرانہ عظمت کی طرف اس غیر یقینی کا سبب خلوصِ نیت کی کمی قرار دینا آسان ہے لیکن ایسا کرنا بھی حقیقی صورتِ حال سے آنکھیں چار نہ کرنے کا بہانہ ثابت ہوگا۔ ادبی تاریخ جید شاعروں کی طرف ایسے انگل حیران کن رویوں سے بھری پڑی ہے جن کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہیں۔ وہ جن کا اپنے زمانہ میں طوطی بولتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ قعرِ فراموشی کا نوالہ بن گئے۔ ملٹن اسی معنی میں فراموش نہیں کیا گیا۔ اگر اسے زیادہ لوگ نہیں پڑھتے یا وہ جدید ذہن کو اپیل نہیں کرتا تو کھوٹ ملٹن میں تلاش کرنے کی بجائے قاری کے ذوقِ سخن اور اس کے مطالعہ کے طریقہ میں تلاش کرنی چاہیے۔ کسی شاعر کے کلام سے لطف اندوزی کی اہلیت گنوا دینے کا معاملہ جتنا شاعر سے تعلق رکھتا ہے اُتنا ہی قاری کے نفسیاتی اور ذہنی میلانات سے بھی متعلق ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ مشکل اور مبہم نظم بھی اگر صحیح لب ولہجہ میں جملوں کی نحوی ساخت اور علاماتِ اوقاف کا خیال رکھ کر آواز میں ڈرامائی اُتار چڑھاؤ کا مناسب طریقہ

اپنا کر پڑھی جائے تو اس کے معنی واضح ہو جاتے ہیں اور اس سے بہتر طور پر لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ شیکسپیئر کو پڑھنے کے لیے ہم بھوتوں اور چڑیلوں پر ایمان نہیں لاتے۔ بلکہ ہماری بے یقینی کو تھوڑے عرصہ کے لیے بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ ہماری مثنویوں کو جو فوق الفطری واقعات سے بھری پڑی ہیں ہم اسی طرح پڑھتے ہیں۔ مرثیوں میں ہمیں یہ بات بالکل پریشان نہیں کرتی کہ ان کی تمام تر تہذیبی فضا عربی نہیں ہندوستانی بلکہ لکھنوی ہے۔ اگر یہ فضا عربی ہوتی تو کیا میر انیس کے مرثیے جمالیاتی طور پر زیادہ حسن آفرین ہوتے؟ مجھے اس میں شبہ ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی دُنیا میں ہم داخل ہوتے ہیں تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ میلوں ٹھیلوں، فقیروں اور اوباشوں کی دُنیا ہے۔ یہاں جو بھی مزا ہے وہ لفظوں کی تیز و تند موجوں پر بے دست و پا بہنے کا ہے۔ زبان کے بحرِ زخار کا نظارہ فی نفسہ اس قدر ہوش ربا ہے اور حیران کُن ہے کہ نظیر سے دوسرے قسم کی شاعری کی توقع ہی نہیں کرتے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ نظیر پچاس بند میں جو بات کہتے ہیں وہ غزل کے ایک شعر میں کہی جا سکتی ہے تو دریا کو کوزے میں بند کرنے کا معجزہ معجزہ ہی سہی، لیکن معجزہ اور کرشمہ شعبدہ اور کرتب ہمیں ششدر کر سکتا ہے لیکن حیرت اور ہیبت کے اس پُر نشاط تجربہ کا نعم البدل نہیں ہو سکتا جو ٹھاٹھیں مارتے ناپیدا کنار سمندر کے نظارے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ تصور اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ شعر میں لفظ گنجینہ معنی بنتا ہے اور ایک خاص قسم کی شاعری مثلاً غنائی شاعری اور غزل کی شاعری کے لیے بہت درست ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شاعری جو بیانیہ ڈرامائی اور رزمیہ ہے (اور وضاحتی ہونے کے سبب ہی ہر لفظ کو گنجینہ معنی بنانے سے انکار کرتی ہے کیونکہ وہ ایسا کرنے بیٹھے تو نظر معنوی تعلیقات اور انسلاکات، صنائع بدائع اور تجنیس میں اس قدر اُلجھ جائے کہ بیانیہ کا فریضہ انجام ہی نہ دے سکے) کمتر درجہ کی ہے بیشک بیانیہ شاعری میں لفظ گنجینہ معنی نہیں بنتا لیکن وہ لفظوں کے جو خزانے لٹاتی ہے وہ فی نفسہ ایک بڑا جمالیاتی اور تخلیقی تجربہ ہے۔

کلیم الدین احمد کی تنقیدوں کے بعد یہ خیال ہمارے ذہنوں میں جڑ پکڑ گیا کہ نظم ایک معنوی اکائی ہوتی ہے اور اس کا امتیازی وصف وحدتِ تاثر ہے۔ اس تصور کی کاری ضرب فارسی اور اُردو شاعری کی روایت پر پڑی۔ معنوی اکائی کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن وحدتِ تاثر کی

بات سمجھ میں نہیں آتی۔ دراصل وحدتِ تاثر کا تصوّر ارسطو سے آیا ہے اور اس کا تعلق ڈرامے کی تین وحدتوں سے ہے۔ دوسری دو وحدتیں وحدتِ عمل اور وحدتِ زماں ہے۔ جو لوگ مغربی ڈرامے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی بھی ڈراما نگار نے حتیٰ کہ شیکسپیئر نے بھی اپنے ڈراموں میں ان تینوں وحدتوں کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ کسی بھی نظم کی خوبی اثر آفرینی ہے لیکن اس اثر کی نوعیت کیا ہوتی ہے کوئی بھی نہیں جانتا اور نہ ہی اسے بیان کرسکتا ہے۔ تاثراتی تنقید نے کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ اگر کامیاب ہوتی تو عام تنقید کا میلان ہی تاثراتی ہوتا کیونکہ تنقید کے لیے اس سے بڑا کارنامہ کیا ہوسکتا ہے کہ جو تاثر شاعری پیدا کرتی ہے، تنقید اسی تاثر کی باز آفرینی کا کام کرتی اور اس طرح اتنی ہی تخیلی اور تخلیقی ٹھہرتی جتنی کہ شاعری، لیکن تنقید نے اِدھر اُدھر گاہے ماہے تاثرات کے بیان پر اکتفا کیا اور مکمل طور پر تاثراتی نہ بن پائی۔ اس کی کوشش یہ رہی کہ تاثر کو بیان کرنے کی بجائے نظم کی فنی خوبیوں، ہیئتی ساخت اور فکری اور احساساتی پہنائیوں پر نظر مرکوز کرے اور ان کے بیان کے ذریعہ نظم کی جمالیاتی قدروں کا تعین کرے۔ یہ وہ کام ہیں جو ایک تربیت یافتہ ذہن کرسکتا ہے جبکہ تاثرات کا معاملہ حددرجہ ذاتی اور وجدانی ہے۔ نظم کے تاثر میں زماں اور مکاں، وقت اور فضا کا بھی گہرا دخل ہوتا ہے۔ عبادت گاہوں کی مقدس فضا میں حمد اور منقبت کا تاثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ جگمگاتی راتوں میں سنگیت کی دھن پر گائی جانے والی یا مدھر ترنّم سے پڑھی جانے والی نظموں کا تاثر بھی کچھ دوسرا ہی ہوتا ہے۔ تنقید کا کام نظم کے فوری تاثر کو بیان کرنا نہیں بلکہ اس شاعری کے محاسن اور اوصاف کا بیان ہے جس کے ساتھ نقاد نے عمر کی مختلف منزلیں گذاری ہوں۔

چنانچہ وحدتِ تاثر کی بنا پر جو اعتراضات جوش کی شاعری پر کیے گئے ہیں وہ بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ بیشک جوش ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھتے ہیں لیکن یہ تو اُردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری کا عام اسلوب ہے اگر شعر کہنے کا یہ انداز ہمیں پسند نہیں تو جوش اور اقبال ہی نہیں بلکہ انوری سے لے خاقانی تک کی تمام شاعری ہمارے لیے از کار رفتہ بن جائیگی۔ کلاسیکی اور قدیم شاعری کو پڑھتے وقت ذہن کو زبان و بیان کے بہت سے اسالیب کے ساتھ ہم آہنگ کرنا

پڑتا ہے۔ دورِ جدید ڈراموں میں کتنے انقلابی تجربات سے عبارت رہا ہے۔ ہمارا ذہن نئے تھیٹر کا ڈھالا ہوا ہے۔ لیکن جب ہم شیکسپیئر اور الزبتھ کے عہد کے ڈرامے پڑھتے ہیں تو اس دور کے ڈرامائی اسالیب اور طریقوں کو سامنے رکھ کر پڑھتے ہیں۔ ہیرو اور وِلن کے ہمارے تصوّرات چاہے اتنے بدل گئے ہوں۔ کلاسیکی ڈرامے کے مطالعہ کے دوران ہم ان تصوّرات کو قبول کرتے ہیں۔ قاری کے ذہن میں اتنی لچک نہ ہو تو دس سال سے اِدھر کا پورا ہزار سالہ ادب غارت ہو جائے۔ سخن گوئی اور مذاقِ سخن کی تبدیلی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قدما کے کارنامے ہمارے لیے فرسودہ ہو چکے۔ ہاں قارئین کا بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جو عصری ادب تو ذوق وشوق سے پڑھتا ہے۔ لیکن قدیم ادب میں اس کی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن ادب کا سنجیدہ طالب علم جدید کے ساتھ ساتھ بلکہ جدید سے کہیں زیدہ محنت اور لگن سے قدیم ادب کا مطالعہ کرتا ہے۔ ہر چیز اسے یکساں طور پر اپیل نہیں کرتی لیکن ہر بڑے شاعر میں اسے کچھ نہ کچھ ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو اس کے ذوق، ادب کی تسکین کرتی ہیں۔ محض جدید ادب کا مطالعہ تو ایک قسم کی بربریت پیدا کرتا ہے۔ وہ تخلیقی تجربات جو وقت کی کسوٹی پر پرکھے نہیں گئے فنی اور فلسفیانہ قدروں کے کسی ایسے نظام کی تشکیل نہیں کرتے جو ادب کی پرکھ کا معیار قرار پائے۔ اسی لیے تجربات اور انحرافات کی بنا پر فنکاروں اور نقادوں کی دعاوی کوئی قیمت نہیں رکھتے تاوقتیکہ تجربہ اور انحراف کو روایت کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ادب کے مطالعہ کے آداب صحافتی چٹخارے سے مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور ادب کا قاری قدیم اور ادق ادب سے لطف اندوزی کی خاطر اتنے صبر وتحمل اور محنت سے کام لیتا ہے جو عموماً محنت کش طالب علم اقتصادیات یا کیمیا کی کتابوں پر کیا کرتے ہیں۔ سوال یہاں شاعر کو برداشت کرنے کا نہیں بلکہ ذہن میں اتنی لچک پیدا کرنے کا ہے کہ مختلف زمانوں کی متنوع شاعری اور ہر نوع کی نثری اور شعری صنفِ سخن لطف اندوزی کی صلاحیت پیدا ہو جائے، بلند جبینی ہمیشہ تنگ داماں ہوتی ہے اور آرٹی شخصیت مذاقِ سخن کی مصنوعی سوفسطائیت کی خاطر ادب کے ایک وافر حصہ کے انبساط کو خود پر حرام کر لیتی ہے۔

ہماری کلاسیکی شاعری کا مختلف اشعار میں ایک ہی مضمون کو تکرار کرنے کا طریقہ معنوی

اِکائی کو قائم بھی کرتا ہے اور اسے مستحکم بھی ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے لیے لفاظی کی نہیں بلکہ قادر الکلامی کی ضرورت پڑتی ہے جس میں شاعرانہ تخیل انوکھی اور اچھوتی لسانی تشکیلات، لفظی تراکیب، تشبیہات، تمثیلات، اساطیر او تلمیحات (جو زبان کے بحرِ زخار میں سیپیوں کی مانند پنہاں ہوتی ہیں) سے معنی کے موتی نکال کر نظم کے ہار میں گوندھ سکے۔ جوش اس طرزِ سخن کے بے مثال شاعر ہیں۔ ایسی نظموں میں مسرّت اور بصیرت کا سرچشمہ نظم کا معنوی ارتقاء نہیں بلکہ معنوی پہلو داری ہے۔ ہر شعر اور ہر بند ایک ہی مضمون کے ایک نئے پہلو کو سامنے لاتا ہے۔ مضمون وہ مرکز ہے جس کے گرد تخیل کا پرکار یکے بعد دیگرے دائرے بناتا ہے جو سطحِ آب کی جھلملاتی موجوں کی مانند قاری کے ذہن کو روشنی اور مسرّت سے چکاچوند کرتے ہیں۔ ایسی نظموں کا حسن تعمیر میں نہیں پھیلاؤ میں ہوتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ ان شاعروں میں تعمیر کا سلیقہ نہیں تھا بہت ہی غلط خیال ہے۔ آخر بیانیہ شاعری کا مثلاً ہماری مثنویوں کا تو پورا حسن ہی تعمیری ہے۔ جوش کی واقعاتی، ماجرائی اور بیانیہ نظموں کو دیکھیے ان میں جوش ایجاز اور کفایتِ لفظی کا ایسا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ نظم اتنی ہی ہوتی ہے جتنا کہ بیانِ واقعہ۔ مثلاً جنگل کی شہزادی، دیہاتی بازار، انگیٹھی جن نظموں میں ذاتی تجربات اور احساسات کا بیان ہے وہ بھی ایسا ہی تعمیری حسن رکھتی ہیں۔

شعر و ادب کی دُنیا کو بھی عام طور پر کائناتِ اکبر کے مقابلہ میں کائناتِ اصغر ہی کہا جاتا ہے۔ ڈانٹے اور گوئٹے، شیکسپیئر اور اور ٹالسٹائی، ہومر اور فردوسی، کالی داس اور غالب نے لفظوں کی کاریگری اور جادوگری سے جو کائنات تخلیق کی ہے وہ خالقِ ازل کی کائناتِ اکبر ہی کی مانند ایسی کارگہِ شیشہ گری ہے کہ ہم چشمِ حیرت سے اس کا تماشا کرتے ہیں اور احتیاط برتتے ہیں کہ اس کے جلال و جمال کے متعلق کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے جو غلط آہنگ ثابت ہو۔ سچ پوچھیے تو آرٹ کے معجزوں کے حضور بھی ہم آہ اور واہ سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

نقاد عموماً کہتے ہیں کہ شیکپیئر اور غالب کو تنہائی میں پڑھتے ہوئے ایک خوف سا محسوس

ہوتا ہے۔ یہ خوف ایک بے پناہ تخیل کی عظمت اور ہیبت اس کے تخلیقی جوہر کی حسن آفرینی اونشاط انگیزی گہرائی کا خوف ہے۔ آرٹ کا کرشمہ اتنا حیران کن، حسن کا تجربہ اتنا شدید اور نشاط کا لمحہ اتنا بیکراں ہوتا ہے کہ ہمارا شعور انھیں جذب نہیں کرسکتا، حواس برداشت نہیں کرسکتے۔ ہمارا اندرورن، ہماری روح آرٹ کے تجربہ سے گزرکر ایک نئی وسعت، ایک نئی گہرائی اور ایک نیا روپ پاتی ہے۔ شیکسپیئر کا ڈراما، ٹالسٹائی کا ناول، غالبؔ کی غزل پڑھنے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پڑھنے سے قبل تھے۔ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ چیزوں کو دیکھنے کا ہمارا انداز بدل جاتا ہے۔ شعور کی سطح، فکر کی نہج اور دردمندی کے مقامات بدل جاتے ہین۔ اس لیے خوف آتا ہے شیکسپیئر ٹالسٹائی اور غالبؔ کو پڑھتے ہوئے کہ ہم ایک قلب ماہیت سے گزرتے ہیں ایک نیا جنم پاتے ہیں، ایک نئی دُنیا میں آنکھ کھولتے ہیں، ایک عظیم فن پارے کے تجربہ سے ہمارا ذہن روز مرّہ کی سطحیات، فضولیات، تواتر اور لاحاصلیت کی سطح سے بلند ہوکر ایک زقند میں اس رنگ منچ پر پہنچ جاتا ہے جہاں فنکارانہ تخیل حسنِ فطرت اور فطرتِ انسانی کے رموز کو بے نقاب کرتا ہے، مشاہدات کو لفظی پیکروں اور استعاروں میں ڈھالتا ہے اور ان جذبات اور احساسات کو شعری اظہار کے ذریعے ایک ہیئت، ایک شکل، ایک شناخت بخشتا ہے جو اظہار نہ پاتے تو بے ہیئت مبہم اور موہوم رہتے۔ ہر شعر اور ہر نظم کا الہامی لمحہ شاعر کا اپنا ہوتا ہے اور صرف ایک وقت کے لیے ہی ہوتا ہے اور اس کے گزرجانے کے بعد اس کی بازیافت ممکن نہیں ہوتی۔ اس لمحہ میں فنکار جبریل کے پروں کی سرسراہٹ اپنے قریب محسوس کرتا ہے۔ وہ تخلیق کے پُرنشاط کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ بقول افلاطون کے وہ اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔ وہ تخلیقی تخیل کی پُراسرار طاقتوں کی گرفت میں ہوتا ہے۔ ذہن کے آفاق پر خیالات استعاروں میں بھٹکتے ہیں اور مرقع ساز الفاظ رنگین تصویروں کا نگارخانہ سجا دیتے ہیں۔ غالبؔ کا مصرع ''محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال''، تخلیقی ذہن کی اس کیفیت کی خوبصورت ترجمانی کرتا ہے۔

موسیقی اور مصوّری میں آرٹ کا اعجاز فوری طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کا میڈیم یعنی آواز اور رنگ سامعہ اور باصرہ کو براہِ راست متاثر کرتا ہے۔ راگ دل میں اُتر جاتا ہے

اور تصویر نظروں کے سامنے ہوتی ہے جبکہ شاعری میں الفاظ ہوتے ہیں جن کے حسّی انسلاکات اور معنوی تعلیقات تک ذہن کی رسائی فوری طور پر نہیں ہوتی۔ آواز اور رنگ کے مقابلہ میں شاعر کے لیے زبان کا میڈیم بیحد کھردرا نالچک دار بلکہ Intractable رہا ہے ہے۔ حرکتِ جسم کی مانند آواز بھی حیاتِ انسانی کا لازمہ ہے اور وجود کی پُراسرار مخفی قوّتوں سے پھوٹتی ہے اسی لیے موسیقی اور رقص میں انسان اپنے پراسرار حیاتیاتی بلکہ جبلی جذبات کے فشار کے تحت جھومتا ہے اور وجد ونشاط کی وہی کیفیت محسوس کرتا ہے جو زندگی کی رگ چھونے سے بنیادی جذبات اور احساسات کی لرزشوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے رقص اور موسیقی میں جسم اور آواز کی حرکت ہی حرکت ہوتی ہے اور جسم اور آواز کی لرزشوں کو معنی جذبات واحساسات کو فکر وخیال میں بدلنے کی وہ کوشش نظر نہیں آتی جو شاعری کرتی ہے۔ شاعری آہنگ اور امیجری کے ذریعے موسیقی اور مصوری سے رشتہ قائم کرتی ہے لیکن اپنی غنایت کو سنگیت کی اس سطح پر پہنچانا جہاں وہ محض آواز یا آہنگ رہ جائے اس کے لیے گھاٹے کا سودا ہے۔ شاعری کا فکری اور خیالی عنصر جو اس کے الفاظ کا عطیہ ہے اسے موسیقی اور مصوری سے اگر ممتاز نہیں کرتا تو مختلف بناتا ہے اور اس کی شناخت قائم کرتا ہے۔ لیکن موسیقی میں آرٹ جس پاکیزہ ترین اور مکمل ترین صورت میں نمودار ہوتا ہے اسے شاعر ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ موسیقی کے منزل ومقام کو پہنچنا شاعری کی لیے ممکن نہیں کیونکہ لفظ میں آواز کی پاکیزگی نہیں۔ زبان ایک کاروباری آلۂ ترسیل ہے اور لفظ جگ بیتیسی سے نکلا ہوا وہ سکّہ ہے جس پر مختلف نسلیں اپنے معنوی نقوش کا کسیلا پن چھوڑ گئی ہیں ہر بڑے شاعر پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ اسے اس لفظ کو اس طرح استعمال کرنا ہے گویا پہلی بار استعمال کر رہا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہیکہ لفظ چورا ہے کی وہ طوائف ہے جسے شاعر اپنے تخیلی لمس سے حجلۂ شعر میں ایک نئی دلہن بناتا ہے ہے۔ شاعروں کو قبیلے کی زبان کے رکھوالے کہنے کے پیچھے ایلیٹ کا مقصد یہی تھا کہ بڑا شاعر لفظوں اور زبان کا استعمال اتنی تازگی اور ندرت حسن آفرینی اور معنوی وسعت کے ساتھ کرتا ہے کہ دوسرے شاعروں کے لیے معنی اپنے قبیلے کے بھائیوں کے لیے اظہار وبیان کی انگنت راہیں کشادہ ہوجاتی ہیں۔ جوشؔ کو زبان کا بادشاہ تو ان کے دشمن بھی مانتے ہیں۔ وہ زبان کے نباض

اور مزاج داں ہیں، اُردو کا وہ کون سا لفظ ہے جس کے آہنگ سے ان کے کان آشنا نہیں اور جس کی معنوی تہہ دریاں اور وسعتیں ان کے ذہن پر روشن نہ ہوں۔ شاعر کے ذہن پر جب اشعار کی بارش ہوتی ہے تو جوشؔ ہی کے لفظوں میں ''الفاظ کی ٹولیوں کی ٹولیاں شاعر کے پاس ہواؤں کے دوش پر آتے ہیں اور اس کی معنویت کے گرد حلقہ باندھ کر اس طرح ناچتے اور گاتے ہیں کہ کبھی تو ماہی سے ماہ تک تبسّم ہی تبسّم جھلکنے لگتا ہے اور کبھی ذرّوں سے لے کر ستاروں تک آنسو ہی آنسو نظر آتے ہیں۔''

اپنے دلچسپ مضمون ''شاعر اور الفاظ'' میں جوشؔ کہتے ہیں؛

> ''الفاظ بھی آدمیوں کی طرح پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، بیمار پڑتے اور تندرست ہوتے ہیں، بڑھتے اور گھٹتے ہیں، گوشہ نشین رہتے اور سفر کرتے ہیں۔ ان میں بھی بعض تو ہم انسانوں کی طرح نیک نام ہوتے ہیں اور بعض بدنام، بعض دستاریں زیب سر کیے ہوئے درباروں میں اور بعض ننگے پانو بازاروں میں مارے مرے پھرتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر وہ کتنی نکتہ رس بات کہتے ہیں اور کیسے دلآویز انداز میں:

> ''شاعر کے سامنے آتے ہی ہر نسل اور ہر مزاج کے الفاظ اپنی نسلوں اور مزاجوں کا جھگڑا بھول جاتے ہیں۔ ذات پات اور رنگ و مذہب کی کوئی آویزش باقی نہیں رہتی۔ وہ سب ایک ہی تھالی میں کھاتے۔ ایک ہی کوزے میں پیتے اور ایک ہی حلقے میں بیٹھ جاتے ہیں شاعر کا مکان الفاظ کی عبادت گاہ ہے، جہاں ادنیٰ و اعلیٰ اور شاہ و گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں اور صفوں میں ایسی شائستگی ہوتی ہے جیسے راگنی کے بولوں میں ہم آہنگی۔''

ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ باقاعدہ نقاد نہ ہونے کے باوجود جوشؔ کو شعروادب

کے عناصر ترکیبی اوران کی مائیت کا کیا شعور حاصل تھا۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ جوش کی شاعری میں فکر کی کمی ہے۔ گویا اقبالؔ کے پیدا ہوتے ہی فلسفہ شاعری کا جزولاینفک ٹھہرا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک شاعر کی امتیازی صفت پوری شعری روایت کی پرکھ کا پیمانہ نہیں بن سکتی جس قسم کی فکر کی ضرورت عموماً شاعروں کو شاعری کرنے کے لیے پڑتی ہے وہ تو جوش کے یہاں بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ میرؔ و غالبؔ اور راشدوفیض کے یہاں ملتی ہے۔ ایلیٹ نے ایک جگہ کہا ہے کہ جہاں تک Thinking کا تعلق ہے تو ایسا نہیں لگتا کہ شیکسپیئر نے بھی بہت کی ہو۔

بیشک اقبالؔ نے انسان اور زندگی فرد اور سماج کے بیشمار مسائل پر مفکرانہ اور پیغمبرانہ انداز سے لکھا ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اقبالؔ کی فکر ہر نظامِ افکار اور فلسفہ کی مانند وقت گزرنے کے ساتھ اپنی اپیل اور معنویت کھو چکی ہے اور ہم عورت اور جمہوریت، اشتراکیت اور فاشزم، مذہب، وطنیت، قومیت اور سیاست پر اس طرح سوچنا پسند نہیں کرتے جیسا کہ اقبال نے سوچا تھا۔

جہاں تک فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے جوشؔ نے اپنی شاعری مین وہ کام کیا جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا تھا یعنی وہ نظر پیدا کی جو شے کی حقیقت کو دیکھتی ہے۔ اقبالؔ کی فکر پر مذہب کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ فنونِ لطیفہ کی ماہیت، انسانی زندگی میں اس کی ضرورت انسان کی تہذیبی روایت میں اس کی حقیقت پر غور کرتے ہوئے فلسفۂ خودی اور مذہب کی روحانی اور اخلاقی اقدار کوفن کا ایسا لازمہ قرار دیتے ہیں کہ وہ تمام فنون اور شعروادب جو عہدِ وسطیٰ کی مذہبی اور متصوّفانہ روایت کے دائرے سے نکل کر زیادہ سے زیادہ سیکولر، انسان دوست اور ارضی بنتا گیا اس کی پرکھ اور تحسین کیسے کی جائے اور اسے کون سے خانے میں رکھا جائے؟ اقبال کی جمالیات اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

پھر ان کا تصوّرِ فن دورِ غلامی کے اثرات کے تحت زیادہ یہ احتجاجی، باغیانہ اور عسکریانہ تھا۔ اکثر ان کا جلال جمال پر غالب آتا ہے اور حکیمانہ بیان طنز میں بدل جاتا ہے اور طنز اپنی فطرت میں جزوی صداقت کا حامل ہوتا ہے۔ میں اقبال کی جمالیت کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتا۔

زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال Apollonian مزاج کے شاعر تھے اور جوشؔ Dionesiyan مزاج کے حامل تھے۔ ہنروران ہند پر اقبال کی نظم خوبصورت ہے لیکن جزوی صداقت کی حامل ہے کیونکہ اقبال کی بات انحطاطی آرٹ کے لیے سچ ہے اور کسی بھی ملک کا پورا آرٹ انحطاطی نہیں ہوتا:

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار

رُوح اور بدن کی تفریق کے ذریعہ اقبال جمالیات کی بحث کو جمالیات اور مابعدالطبعیات تک لے جاتے ہیں جو غلط نہیں کیونکہ حسن کا تصوّرحسنِ ازل سے وابستہ ہے، لیکن دورِ جدید کے شعری اور ادبی تصوّرات عہدِ وسطیٰ کے متصوّفانہ تصوّرات اور مذہبی مابعدالطبعیات سے دامن چھڑاتے ہیں اور ان بیانات کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں جن میں حتمی اور قطعی طور پر خودی اور اثباتِ خودی کو آرٹ اور جمالیات کی اساس قرار دیا گیا ہو۔ پھر راشد کے الفاظ میں وہ خواب جو فلسفی نے دیکھا تھا کابوس بن گیا ہے اور اقبالؔ کے بہت سے تصوّرات اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔

اقبالؔ کے برعکس جوش کی کوشش یہ رہی ہے کہ فنونِ لطیفہ کی اصلیت اور اس کے جوہر کو تخیّل کی گرفت میں لایا جائے۔ پیغام فرسودہ اور از کارِ رفتہ ہوسکتا ہے حقیقت کا بیان نہیں۔ مثلاً اقبالؔ اپنی چار مصرعوں کی نظم 'رقص' میں بدن کے رقص اور رُوح کے رقص میں تفریق کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

صلہ اس رقص کا ہے تشنگیِ کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

ممکن ہے اس بیان میں حکیمانہ گہرائی ہو۔ لیکن رقص و موسیقی عالمِ انسانیت کے آغاز ہی سے انسان کے جذبات کے اظہار کا ذریعہ رہے ہیں اور جن جذبات کا وہ اظہار کرتے ہیں وہ نہایت ہی پُر اسرار قدیم اور تہہ دار رہے ہیں۔ یورپ کے رقص بدن کو مسترد کرنے کے لیے اقبال کا بیان اچھا ہے اور مشرق و مغرب رُوحانیت اور مادّیت کی پیکار میں ایک حزبی نقطۂ نظر کی سرشاری بھی عطا کرتا

ہے لیکن فی نفسہ رقص کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں بتا تا جسے شاعرانہ تخیل کا بلاشرکتِ غیرے امتیاز کہا جاسکے۔ یہ کام رقص اور شاعری دونوں پر اپنی نظموں میں جوش کرتے ہیں۔ رقص پر جوش کے یہ اشعار دیکھئے اور حیرت زدہ ہوئیے کہ تخلیقی تخیل کی گرفت میں جوش نے اس جوہر کو تھامنے کی کوشش کی ہے جو مشکل ہی سے الفاظ کے پیمانوں میں ڈھلتا ہے۔ لیکن رقص کا جوہر ایسی چیز ہے جو سوائے الفاظ کے علم و دانش کی گرفت میں آتا ہی نہیں، اور الفاظ بھی خصوصی طور پر وہی جو شاعرانہ تخیل کی آنچ میں کندن بن کر نکلے ہوں۔ جو نا قابل اظہار ہے شاعری اسے اظہار بخشتی ہے اور رقص کے بارے میں جو علم وہ عطا کرتی ہے وہ کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں:

رقص کیا ہے؟ خاک کے دل میں خروشِ کائنات
پیکرِ فانی میں گرمِ ناز، لافانی حیات
جلوۂ محدود کے دل میں بہ ایمائے شباب
حسن لامحدود بن جانے کا شیریں پیچ و تاب
چاندنی میں جوئے شیریں جیسے تھم تھم کر بہے
انگڑیوں کی شعر گوئی، ساعدوں کے زمزمے
محفلِ صورت میں لیلائے معانی کا بناؤ
چشمکِ بے باک میں سیال نغموں کا بہاؤ
خون میں لہروں پہ لہریں لحن بے آواز کی
لغزشوں پر لغزشیں مشقِ خرامِ ناز کی
معنیٔ بے لفظ کی شرح، دل آویز و خموش
جرأتِ پنہاں کی بے تابی، تمنا کا خروش
دست و پا کے موج میں اس حرفِ مبہم کا ظہور
نطق کی پرواز سے ہے آشیانہ جس کا دور

شاعرانہ تخیل کی یہ نکتہ رسی بہت عام چیز نہیں ہے۔ خود جوش کا تخیل بھی منتخب لمحات، میں ہی یہ کام

کرتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کے یہاں موسیقی، مصوّری اور فنِ تعمیر پر قابل ذکر نظمیں نہیں ہیں۔ اقبالؔ کے یہاں ہیں تو اس سبب سے نہیں کہ اقبالؔ کا تخیل جوشؔ سے زیادہ سریع الحس اور نکتہ آفرین تھا بلکہ اس سبب سے ہیں کہ فنونِ لطیفہ Ideological Slant کے ساتھ تبصرہ کرنے میں کچھ سہولتیں بھی ہیں جن کا پیغامبر شاعر خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جوشؔ ایسی سہولتوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور اس وقت تک لب کشا نہیں ہوتے جب تک اس حقیقت کی تھاہ نہ پالیں جسے بے نقاب کرنے کا مقدور صرف شاعرانہ تخیل کی دسترس میں ہے۔

جوشؔ کے بعد کی شاعری زیادہ امچسٹ بنی کیونکہ اوّل تو شاعروں کو اقبالؔ کی طرح چیزوں کو ایک ہی زاویہ سے دیکھنے میں دلچسپی نہیں تھی، دوئم ان کا تخیل جوشؔ کی نکتہ رسی کی طرف اتنا مائل نہیں تھا۔ سلامؔ مچھلی شہری کی نظم ''جنگلی ناچ'' یوسفؔ ظفر اور قیومؔ نظر کی رقص پر نظمیں، مختار صدیقی کی فنِ تعمیر اور موسیقی پر نظمیں، عمیق حنفی کی موسیقی اور مصوّری پر نظمیں سب تاثراتی ہیں۔ بھلی بُری جیسی ہیں اقبالؔ اور جوشؔ سے مختلف انداز کی ہیں اور نئی شاعری کے اس میلان کی آئینہ دار کہ فنون لطیفہ کے تجربہ کی سریت کو امیجری کے ذریعہ گرفت میں لیا جائے۔ نئے شاعروں نے شاعری پر بہت کم لکھا کیونکہ شاعری کے جوہر کو علم کے دائرے میں لانے کے لیے جس نکتہ رس اور معنی آفرین تخیل کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا تخیل جو تجنیس اور تضاد کی صنعتوں، قولِ محال، استعاروں اور تشبیہوں سے مزیّن اسلوب کی آرائش اور مشاطگی سے واقف ہو، نئے شاعروں کے لیے کلاسیکی دور کی یادگار رہ گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری میں شاعری کے موضوع پر سب سے زیادہ اور سب سے دلچسپ نظمیں جوشؔ کی ہیں۔

جوشؔ کی شخصیت اور شاعری کے متعلق اتنی غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں عام کی گئی ہین کہ یہ کہنا بھی کہ جوشؔ نے شاعری پر بہت نظمیں لکھی ہیں ان لوگوں کے ذہن میں جو جوشؔ کی شاعری سے سرسری گزرتے ہیں فوراً یہ خیال پیدا کرسکتا ہے کہ ان نظموں میں سوائے شاعرانہ تعلّی کے کیا دھرا ہوگا۔ جوشؔ کی شخصیت اور شاعری دونوں کے متعلق ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ دونوں میں

جوش نے بڑی اندرونی کشمش کے بعد ایک ایک ایسا توازن پیدا کیا تھا جو بہت کم شاعروں کو حاصل ہوا ہے۔ دراصل جس چیز کو جوش کی لفاظی سمجھا جاتا ہے وہ اسی کشمکش کے بیشمار پہلوؤں کے نازک ترین اور لطیف ترین تضادات کو ایک توازن میں بدلنے کی کوشش ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ملٹن اور اقبال کے شیطان پر جتنے دلچسپ مضامین لکھے گئے ہیں اُتنے ان کے خدا پر نہیں لکھے گئے اور ''جوش اور خدا'' کے عنوان سے سلیم احمد جیسے مذہب زدہ نقاد نے جو مضمون لکھا ہے وہ اقبال اور خدا پر لکھے گئے مضامین سے کم دلچسپ اور معنی خیز نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں خدا کے مذہبی اور فلسفیانہ تصوّر کے بیچ آویزش ہے اور جوش کے یہاں عقلیت اور ہیومنزم کی زائیدہ اس تشکیک کی کربناک کشمکش ہے جو دوستووسکی کے کردار ایوان کاراموزوف کی طرح کائنات میں انسان کی بے معنی اذیت (Meaningless Suffering) کو قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہیں پر جوش کی شاعری اس بے پناہ اور آفاقی دردمندی Compassion کو اپناتی ہے جو دورِ جدید میں کلاسیکی ٹریجیڈی کے امکانات ختم ہونے کے بعد کائنات میں جاری وساری شر کی تباہ کاریوں اور روندی اور کچلی ہوئی انسانیت کی طرف ایک ہیومنسٹ فنکار کا واحد جذباتی رویّہ رہ جاتا ہے۔ اس دردمندی کا سب سے توانا اظہار ہمارے افسانوں میں ہوا ہے، لیکن شاعری کا دامن بھی اس سے خالی نہیں رہا، گو شاعری میں شاعر کی اثباتِ خودی کا عنصر اتنا شدید ہوتا ہے کہ ایمان، یقین، تلقین اور بشارت یا Dionesiyan مزاج کی زائیدہ رومانی نرگسیت، خود بینی، کیف ومستی اور عیش کوشی کے میلانات کی تیز وتند موجوں کے سامنے دردمندی کا چراغ لڑکھڑانے لگتا ہے۔ افسانہ نگار کو تو واقعات کا بھنور ہی المیہ کے مرکز میں لا کھڑا کرتا ہے اور اگر وہ دردمندی کو راہ نہیں دیتا تو سفاک بن جاتا ہے۔ ہمارے یہاں واقعات اور ماجرائی نظموں کے قحط کے سبب شاعر کو دردمندی کے مقامات کم ہی حاصل ہوتے ہیں اور یا تو وہ احتجاجی اور تلقینی شاعری کی کم تخیلی اور خطیبانہ فضاؤں میں سانس لیتا ہے یا نرگسیت، اعصاب زدگی، جذباتیت اور خود ترحمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جوش کے ہیومنزم نے جس دردمندی کو راہ دی اس پر نقادوں کی نظر کم ہی پڑی ہے۔ یہی سبب ہے لوگوں کو جوش کے یہاں خروش وخطابت، بلند آہنگی اور لفظی طمطراق نظر آتا ہے لیکن

اسالیب کے وہ رنگ دکھائی نہیں دیتے جو دلِ خوں شدہ کی گلابی کی حدّت سے تمتمائے ہوئے ہیں۔

ترقی پسند اور جدید دونوں قسم کی تنقیدوں نے جوشؔ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ فیضؔ نے جوشؔ کی انقلابی شاعری پر حرف گیری کی، ٹھیک ہے، وہ خراب شاعری ہے لیکن کونسی انقلابی شاعری اچھی ثابت ہوئی۔ جوشؔ کی مردانہ گھن گرج میں اپیل نہیں تو دارورسن کی طرف رقص کناں اور غزل خواں بڑھنے کی غنائیت میں کونسی اپیل رکھی ہوئی ہے۔ بیشک جوشؔ ہم وطنوں کو بے رحمی سے لتاڑتے ہیں، جس میں ہم سفری اور ہم مشربی کے رفیقانہ جذبہ کا فقدان ہے لیکن تاریک قدم قدم پر جوشؔ کی ہم وطنوں پر سفاک تنقید کو درست ثابت کر رہی ہے اور دوسرے انقلابی شعرا کے یہاں معاشرے کے منفی رجحانات کی نکتہ چینی سے پہلو تہی کو شوونزم اور سہل رجائیت کا نتیجہ ثابت کر رہی ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے اپنے متعصبانہ اور Damaging مضمون میں جوشؔ کو مغلوب الغضب آدمی بتایا ہے۔ خلیل الرحمن کے پاس وہ بصیرت نہیں تھی جو شخصیت کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے ضروری ہے، ورنہ وہ یہ بھی دیکھتے کہ اپنی زندگی اور شاعری میں حلم و بُردباری اور ضبط و نظم پیدا کرنے کے لیے ایک مغلوب الغرض طبعاً حساس، خوددار اور پُرغرور شخصیت کو کیسے نفسی مجاہدے سے گزرنا پڑتا ہے۔ جوشؔ کی شخصیت کی دلربائی اسی اندرونی تربیتِ نفس کا نتیجہ تھی۔ رندانہ طبیعت اور ذوقِ سخن نے تربیت کے مراحل کو آسان کیا۔

جوشؔ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہیچ مدانی نے ہمہ دانی کا نقاب کیسے اوڑھ رکھا ہے۔ کرمِ کتابی کیوں شاعری کی پروازِ تخیل کو نہیں سمجھ پاتا۔ انھوں نے اپنے طور پر تخیل انتقاد، تخریبی انتقاد اور تحقیقی انتقاد کی قسمیں قائم کی تھیں اور ان کے ذیل تنقید کے متعلق جو باتیں بتائی ہیں وہ ہمارے پورے تنقیدی منظرنامہ کی آج بھی ایسی ہی سچائی سے آئینہ داری کرتی ہیں جیسا کہ اس وقت جبکہ یہ مضمون لکھا گیا تھا۔

اپنی نظموں میں بھی جوشؔ شاعر کا ہر پہلو سے جائزہ لیتے ہیں۔ وہ شاعر کو لیڈر، نقاد،

علامہ اور معتزلین کے مقابلہ میں رکھ کر پرکھتے ہیں اور فطرت، کائنات، زندگی اور انسانی معاشرے میں اس کا کیا مقام ہے اس کا ایسا تجزیہ اور بیان کرتے ہیں جس کی مثال اُردو شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی۔

عالم اور شاعر میں پیکنزم اور Scholasticism کی ازلی پیکار نظر آتی ہے۔ اس موضوع پر اُردو میں سب سے اچھی نظم اختر الایمان کی کرم کتابی ہے۔ جوشؔ بتانا بھی چاہتے ہیں کہ شاعر کا سرچشمۂ علم مدرسہ نہیں آغوشِ فطرت ہے۔ لیکن اس خیال کا بھی بہترین اظہار ان کی نظم نقاد میں ہی ہوا ہے۔ وہ نقاد سے کہتے ہیں:

اے ادب نا آشنا یہ بھی نہیں تجھ کو خیال
تنگ ہے بزمِ سخن میں مدرسے کی قیل و قال

تنقید کو کیا ہونا چاہیے اس کے متعلق جوشؔ نے شعری بیان کو نازک خیالی سے دل پذیر ہی نہیں بلکہ بصیرت افروز بھی بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یعنی اک لے سے لبِ ناقد کو کھُلنا چاہیے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تلنا چاہیے

آپ جوشؔ کی بات چھوڑیے کہ وہ تو ہمیشہ حبِّ اقبالؔ کے مقابلہ میں بغضِ معاویہ کے شکار رہے، خود غالبؔ کا معاملہ لیجیے کہ عبدالودودی اور عبداللطیفی عالمانہ نخوت کا ہدف رہے اور ایسے اذہان کی نکتہ چینی اور حرف گیری کا نشانہ جنھیں قسامِ ازل نے تنقید اور شاعری دونوں سے بارہ پتھر دور رکھا تھا۔

ہوش مند تنقید کے لیے بلکہ شعر فہمی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی حیات و کائنات کے جلوۂ صد رنگ کا اسی طرح تماشائی رہا ہو جیسے کہ شاعر کیونکہ شاعری الفاظ کا مایا جال نہیں ہے بلکہ لفظوں کے پیچھے اس شاعر کا دل دھڑکتا ہے جس نے اپنے تمام حواس سے کائناتِ رنگ و بو کو اپنے وجود میں جذب کیا ہے، تجربات کو احساس کی تیز دھار سے گذارا ہے اور اپنے شعور کو مشاہدات کی تجلیوں سے منوّر کیا ہے۔ محض علم کتابی عروض و قواعد کے دقائق صحتِ زبان اور علمِ بیان کی

موشگافیاں حروف اصوات کا کاریگرانہ ناپ تول- یہ دیکھنے کے لیے کہ گھڑی کام کیسے کرتی ہے، گھڑی کے پرزے الگ کرنا ہے-لیکن صحیح سخن دانی تو ماورائے سخن جو بات ہے اسے اپنے دام میں لاتی ہے۔ کائنات کے جو اسرار و رموز شاعر کو حیرت زدہ کرتے ہیں شاعری جو کائناتِ اصغر ہے، کیونکہ محض کاریگری اور صنعت گری نہیں، تخلیق و تخیل ہے، وہ بھی نقاد کو حیرت زدہ کرتی ہے۔ تحیّر و تجسس وارفتگی اور ربودگی کے مقامات سے گزرے بغیر ناقدانہ شخصیت میں وہ لطافت اور لچک پیدا نہیں ہوتی کہ تنقید پھول کی پنکھڑی پر قطرہ شبنم کے تلنے کا اعجاز پیدا کرے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جوشؔ نقاد سے اخلاقی رویّوں کا مطالبہ نہیں کر رہے۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ نقاد کے ذہن کو غیر متعصب، منصفانہ بیباک یا ہمدردانہ وغیرہ ہونا چاہیے۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ جن مقامات سے شاعر کا دل گزرا ہے انھی مقامات سے نقاد کا دل بھی گذرے تو احساس میں وہ نزاکت پیدا ہوسکتی ہے کہ گھِسے اخلاقی رویّوں میں خود بخود لچک پیدا ہو جائے۔ اس وقت لبِ ناقد کا کھلنا بھی شگفتن گل ہائے ناز کا نظارہ پیش کرے گا اور تنقید وہ خارزار نہیں رہے جس کے ہر کانٹے پر لہولہان شعر کی فریاد کناں لاش تل رہی ہو۔

یہ چند شعر دیکھیے جس میں جوشؔ نقاد سے پوچھتے ہیں:

جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا تو نے داغ
آنچ سے جس کی غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ
دل سے اپنے پوچھ اے زندانی علمِ کتاب
حسنِ قدرت کو بھی دیکھا ہے برافگندہ نقاب
تو پتہ اسرارِ ہستی کا لگاتا ہے کبھی
خامشی کی نغمہ ریزی پر بھی سر دُھنتا ہے تُو
قلبِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہے تو
ان بُتوں کی بزم میں بھی تو ہوا ہے باریاب
خاک کو پرچھائیاں جس کی بناتی ہیں گلاب

تیری نبضوں میں بھی مچلی ہے کبھی بجلی کی رو
سوزِ غم سے ترا دل بھی کیا کبھی دیتا ہے لو؟
مجھ سے آنکھیں تو ملا اے دشمنِ سوز و گداز
تجھ پہ کیا اضداد کی توحید کا افشا ہے راز؟
طورِ معنی پر بھی اے نافہم چڑھ سکتا ہے تو
کیا مصنّفِ کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تُو
یہ نہیں تو پھیر لے آنکھیں یہ جلوہ اور ہے
تیری دُنیا اور ہے شاعر کی دُنیا اور ہے

زندانی علمِ کتاب اور کتاب دل کا نقاد، جوشؔ کو ایک ایسے تصوّرِ شعر کی طرف لے جاتے ہیں جو دُنیائے نقد وادب میں صرف ایک فلسفی کروشے کے یہاں ملتا ہے۔ اس اطالوی مفکّر سے اظہاریت یا تصوّر منسوب ہے جوشؔ اور کروشے کے تصوّرات میں مماثلت بالکل اتفاقی ہے کیونکہ جوشؔ فلسفہ کے آدمی نہیں تھے اور پھر کروشے کا پڑھنا جس کے تصوّر کو کوئی اہمیت نہ ملی اور جسے ادبی تنقید نے فوراً ہی رد کردیا، تو مزید بعید از قیاس ہے۔ کروشے کا کہنا ہے کہ نظم کی تخلیق تو وجدانی سطح پر ہی مکمّل ہو جاتی ہے۔ تخلیق کا لمحہ وہی لمحہ ہوتا ہے جب گنجفہ بازِ خیال محفلیں برہم کرتا ہے۔ باقی جو ہے وہ اظہار اور بیان کا کھڑاگ ہے۔ پتّے پھینٹنا ہے۔ لفظوں کے پیمانہ میں ڈھل کر شاعری وجدان کی مئے دو آتشہ اپنا کیف و سرور قائم نہیں رکھ سکتی۔ تخیّل کی آنکھ نے جن تصویروں کا مشاہدہ کیا لفظوں میں بیان ہوتے ہیں ان کے نقش و نگار اپنا رنگ و روغن کھو بیٹھتے ہیں۔ غالبؔ جب کہتے ہیں کہ:

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یا

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال

تُو ان کے سامنے تخلیق شعر کا وہ لمحہ نہیں جو صرف شاعر کو میسّر ہے بلکہ وہ تو ذہن انسانی کے ایک وصف کو بیان کرتے ہیں جو تمام انسانوں میں مُشترک ہے، لیکن جوشؔ تو خیال اور اظہار کے درمیان فاصلہ قائم کرتے ہیں۔

تخلیقی تجربہ اور اظہار کے بیچ جو فاصلہ ہے اس کا ذکر اپنی نظم نقاد میں کرتے ہوئے جوشؔ کہتے ہیں کہ ان کے اشعار تو خالی سیپیاں ہیں، اصل موتی تو دل ہی میں رہ گئے۔ شاعر کے دل میں جو بات ہوتی ہے نظم میں آتے آتے اپنا رنگ و آہنگ کھو دیتی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بیشمار
نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعری کی ترکیبِ ادب
ڈھل کے گو وہ گوہرِ غلطاں کا پاتی ہیں لقب
اور ہوتی ہیں تجلّی بخشِ تاجِ زرفشاں
پھر بھی وہ شاعری کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں
جن کے اسرارِ درخشاں رُوح کی محفل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہیں

نظم کے آخر میں وہ نقاد سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تو سمجھتا تھا جو کہنا چاہیے تھا کہ گیا
پوچھ شاعر سے کہ وہ کیا کہہ سکا کیا رہ گیا
کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

جوشؔ ہوں یا کروشے ان کے اس تصوّرِ شعر کو نقادوں نے قبول نہیں کیا۔ کروشے کو تو صاف ان گڑھ بے معنی اور غیر اہم فلسفی گردانا گیا۔ وجہ صاف ہے کہ شاعری کا معاملہ تصوّف کے برعکس نہ صرف تجربہ کے اظہار ترسیل سے اس قدر جڑا ہوا ہے کہ ترسیل کی دُشواریاں پیدا کرنے والی نظم پر دُشوار

پسند طبیعتیں بھی صبر کر کے سامنے وہ پوری تصیر آجائے جسے وہ کینوس پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ افسانہ نگار ناول نگار اور ڈراما نگار تو بیٹھ جاتی ہیں۔ مصوری میں یہہ ممکن ہے کہ وجدان کی سطح پر مصور کے چشم تصور کے اس وقت تک کوئی سچویشن یا منظر ضبطِ تحریر میں لا ہی نہیں سکتا جب تک کہ اسے اپنے ذہن کے اسٹیج پر کھیل نہ لے۔ ممکن ہے بیانیہ شاعری میں شاعر اسی طرح تخئیل کی مرقع سازی کے مزے لوٹ سکتا ہو، لیکن شاعری ہمارے بصری تخئیل ہی کو حرت میں نہیں لاتی بلکہ سماعی تخئیل کو بھی لفظ کے آہنگ کی مضراب سے چھیڑ کر موسیقی کی طرح سُر کی جوت جلا کر احساس اور جذبہ کی دُنیاؤں کو منور کرتی ہے۔ پھر شاعری میں فکر و فلسفہ بھی ہوتا ہے اور خیالات بھی جو مرقع سازی سے الگ اظہار کے پیانے ترشتا ہے۔ فی الحقیقت شاعری کے دانشورانہ مظروف کے سبب ہی اسے موسیقی اور مصوری پر فوقیت ہے۔

جوشؔ کی شاعری کا عام میلان منظر سازی کی طرف رہا ہے۔ ممکن ہے شاعر کے اندر چھپا ہوا مصورانہ رنگین مناظر کو دیکھتا ہو لیکن لفظ رنگ نہ ہونے کے سبب ان کی تصویر تشفی بخش طریقہ پر نہ کھینچ سکتا ہو۔ غزل گو شاعر کے مقابلے یہ دُشواری نظم گو شاعری کو زیدہ پیش آتی ہے کیونکہ اُردو میں نظم کی رویت غزل جیسی شاندار نہیں۔

دراصل جوشؔ بلبل کے نالۂ بے اختیار شوق کے طلب گار ہیں۔ زبان میں اظہار کی وہ سکت نہیں جو مغنّی کو آواز میں اور مصوّر کو رنگ میں میسّر آتی ہے۔ زبان خلّاق شاعروں کے لیے ہمیشہ ایک ضدی میڈیم ثابت ہوا ہے ہر نئی نظم کے اظہار کے وقت وہ سرکش ہو جاتا ہے اور بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں بھی مکمّل اظہار کم ہی ہاتھ آتا ہے اس لیے بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں بھی جنھیں آرٹ کا مکمّل نمونہ کہا جا سکے ایسی نظموں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ شاعرانہ اظہار کی راہ میں زبان کیسے سنگِ گراں کی مانند حائل ہے اس کا بیان دیکھیے:

شاعری کا خانماں ہے نطق کا لوٹا ہوا
اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیں سے ٹوٹا ہوا
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دل سرشار پر

لوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لب گفتار پر
جام میں آتے ہی اڑ جاتی ہے شاعر کی شراب
ٹوٹ جاتا ہے کنارے آتے آتے یہ حباب

شعری تجربہ کی قلبی یا وِجدانی کیفیت کا مئے اور موسیقی کے استعاروں کے ذریعہ اظہار جیسا کہ ان اشعار میں ہوا ہے وہ بھی شاعر کے عجزِ بیان کا ہی غماز ہے کہ تخلیقی لمحہ کی کیفیت کو صرف ایک نغمگی اور سرور کی کیفیات سے زیادہ ٹھوس رُوپ عطا نہیں کرسکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ تخلیق کے وِجدانی لمحہ کی شاعرانہ کیفیت کا حال ہم کس طرح جانیں تاوقتیکہ یہ کیفیت اظہار کی گرفت میں نہ آئے۔ گویا ہم اس کیفیت کا حال کسی طرح جان نہیں سکتے۔ ہمارے علم کی دسترس میں وہی چیز ہوتی ہے جو اظہار پاتی ہے۔ شاعر کے اندورن میں کیا محفلیں برہم ہورہی ہیں وہ ہم نہیں جان سکتے۔ ممکن ہے شاعر ایسے کیف اور خواب کے عالم سے گزرتا ہے جس کا بیان اس سے ممکن نہیں۔ صوفی کے تجربۂ حُسن ونشاط کے مانند شاعر کا تجربہ بھی شرمندۂ اظہار رہتا ہے، لیکن شاعر کی شناخت تو اس کے اظہار سے ہے۔ ہمیں اس کے وجدانی تجربہ میں کوئی دلچسپی نہیں تاوقتیکہ وہ اظہار نہ پائے۔ بات اتنی سی ہوتی تو جوشؔ کی نظم قابلِ اعتنا نہیں تھی، لیکن اب نظم کا وہ حصّہ آتا ہے جو تخلیقی تخیل کے اعجاز کا نمونہ ہے۔ یہی نظم کا حاصل ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ اس میں تخلیقی تجربہ اور اظہار کے بیچ جو فاصلہ ہے اسے پاٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اِس کوشش میں وجدانی کیفیت کا تھوڑا بہت سراگ بھی ملتا ہے اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کیفیت شعر میں کیسے ڈھلتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ Nebula کی دُھندلی سی تصویر بھی ہے اور اس کے مادّے سے تشکیل پائے ہوئے ستاروں یعنی شعروں کی جھلک بھی ہے۔ ان اشعار میں جوشؔ نے شاعر کا بلندترین مقام چھولیا ہے وہ جو نا قابلِ اظہار ہے اسے اظہار بخشا ہے۔ شعر کیا ہے ایک ایسی کیفیت یا تجربہ کا بیان جو پورے طور پر شعر میں ڈھل نہیں پاتی۔ شعر کو خالی سیپی، ٹوٹا ہوا نغمہ اور وہ جامِ شراب جس میں سے شراب اڑگئی ہے تو جوشؔ نے کہہ دیا، لیکن یہ تو شعر کی منفی تعریف ہوئی -- اس کی ایسی اثباتی تعریف بھی ہونی چاہیے جو اس کے حسن، اسکی چمک اور شیرینی اس کی نغمگی اس کے الہام اور پیچیدگی میں معنویت کی روشنی،

تصنع یا صنعتوں کے بیچ اس کا فطری بہاؤ، اس کا ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا یقین، اس مین لفظ و معنی کا توازن محدود ہیئت میں لامحدود معنی کا پھیلاؤ، گھسے پٹے لفظوں کے سازوں سے لحنِ داؤدی کی پھیلتی شعائیں اور پھر شعر کے حسن میں کائنات کے حسن کا عکس، پیچ و خم کھاتے بگولوں میں چمکتے ذرّات اندھیری رات میں رنگین ستارے کا ٹوٹنا، نیم بیداری میں موج کا بہنا، برگِ گل پر شبنم کے گرنے کی صدا -- یہ بھی تو شعر ہی کے حسن کی نشانیاں ہیں، کیونکہ شعر میں اگر الہام ہے اشاریت ہے، علامت ہے تو وہ ایک نقش ناتمام بھی ہے مبہم سا کلام بھی ہے، مرتعش سی آواز بھی ہے اور گو شعر کے حسن میں، اس کی بزم جمال میں عقل و جنوں دونوں صدر نشین ہیں، عشق و حکمت ہم نشین ہیں، لیکن اس سے شعر میں نہ تو غوغائے مدرسہ بلند ہوتا ہے نہ شورِ پندِ ناصح کیونکہ شعر تو فطری طور پر ایمائیت اور اشاریت کے اس حسن کا حامل ہوتا ہے جو تخیل اسے بخشتا ہے اسی لیے شعر میں معنی و اشگاف نہیں ہوتے اور وہ شعر میں اسی طرح آنکھ مچولی کرتے ہیں جس طرح بادلوں سے چاند، اور وہ اپنا ڈھکا چھپا چہرہ اسی طرح دکھاتے ہیں جس طرح سمندر کی دلہن قطرے کی کھڑکی سے جھانکتی ہے۔ میں پوچھنا چاہوں گا کہ شاعری کی یہ بوطیقا جدید ترین تصوّراتِ شعر کا احاطہ کرتی ہے یا نہیں اب میں جوشؔ کی نظم سے یہ اشعار ان لوگوں کی خدمت میں پیش کروں گا جن کی زبان جوش کو لفاظ کہتے ہوئے نہیں تھکتی۔ بڑی شاعری پڑھنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں جن سے عموماً وہ لوگ واقف نہیں ہوتے جن کی عمریں اقبالؔ کی امامت میں سجدۂ سہو پڑھتے گزرتی ہیں، اب جوشؔ کے اشعار دیکھیے:

شعر کیا جذب، دروں کا یک نقشِ ناتمام
مشتبہ سا اِک اشارہ ایک مبہم سا کلام
کیف میں اِک لغزشِ پا کلکِ گوہر بار کی
اضطراری ایک جنبش سی لبِ گفتار کی
ایک صوتِ خستہ و موہوم سازِ ذوق کی
مرتعش سی ایک آواز "انتہائے شوق" کی

''بے حقیقت لے'' کے اندر زمزمہ داؤد کا
عارضِ محدود پہ اِک عکس لامحدود کا
''شعر کیا؟'' عقل و جنوں کی مشترک بزمِ جمال
شعر کیا ہے؟ عشق و حکمت کا مقامِ اتصال
ظلمتِ ابہام میں پرچھائیں تفصیلات کی
پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرّات کی
جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں
ٹوٹنا رنگیں ستارہ کا اندھیری رات میں
شعر کیا؟ کچھ سوچنا دل میں بہ لحنِ دل نشیں
شعر کیا؟ ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا یقیں
شعر کیا ہے نیم بیداری میں بہنا موج کا
برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا
تر زبانی اور خاموشی کی مبہم گفتگو
لفظ و معنی میں توازن کی نہفتہ آرزو
بادلوں سے ماہ، نو کی اِک اُچٹی سی ضیاء
جھانکنا قطرہ کے روزن سے عروسِ بحر کا
مر کے بھی تو شاعری کا بھید پاسکتا نہیں
عقل میں یہ مسئلہ نازک ہے آسکتا نہیں

جوشؔ دُنیا میں پہلے شاعر نہیں ہیں جنھوں نے شاعرانہ الہام کی دیوی کے خوبصورت چہرے کی نقاب کو محبت اور عقیدت کے جذبات سے کانپتی ہوئی انگلیوں سے ہٹانا چاہا ہو۔ جوشؔ کو اس کا ئناتِ رنگ و بُو اس حیرت کدۂ عالم کے پیچھے عقل و فراست سے ماوراء کسی پُر اسرار طاقت کے ہونے کا احساس تھا جسے ہو مولویوں کے دیے ہوئے تصوّرِ خدا کے رُوپ میں قبول کرنے کو تیار نہیں

تھے۔ شعر گوئی ان کے لیے کبھی قافیہ پیمائی اور موزوں بیانی نہیں رہی۔ اُردو میں غزل کے سبب شاعری کی ارزانی دیکھ کر چراغ پا ہونے والوں میں جوشؔ تنہا نہیں تھے۔ مضامین میں غزل کی تنقید کے علاوہ ایک پوری نظم 'غزل گوئی' کے عنوان سے ان کے یہاں ملتی ہے۔ اس نظم کا بیشتر حصہ بھی حقیقی شاعر کی تعریف میں ہے۔ ظاہر ہے غزل کی تنگ دامنی کے مقابلہ میں وہ شاعرانہ ذہن کی وسعتوں اور رنگارنگیوں کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں اِس طرح کرتے ہیں کہ زمین وآسمان کا ہر منظر اور حیات وکائنات کا ہر مظہر شاعرانہ تخیل کی کمند میں اسیر نظر آتا ہے۔ ایسی نظموں میں یہ بڑا خطرہ ہوتا ہے کہ شاعر کی تعریف خود کی تعلّی میں بدل جاتی ہے۔ جوشؔ اس پل صراط سے بہت محفوظ گزر گئے ہیں۔ دراصل جوش کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ شاعری کی الہامی اور وجدانی طاقتوں کے ہاتھ میں ایک ادنیٰ سا کھلونا ہیں۔ تخلیق شعر میں جہاں شعور سرگرم کار ہوتا ہے وہاں لاشعور شاعر کی مخفی تخلیقی قوّتوں کے سوتے بھی کھول دیتا ہے۔ وہ علامات، اساطیر اور استعارے جو لاشعور اور اجتماعی لاشعور کے درمیان حرکت کرتے ہیں اور جو شاعری کی شعری روایت کا بھی ورثہ ہیں اور اس تہذیب کا بھی جس کا سراغ تاریخی ظلمتوں میں گم ہے، شاعر کے نوکِ قلم پر جھلک اُٹھتے ہیں۔ میرؔ و غالبؔ اور اقبالؔ و جوشؔ جیسا شاعر تو کبھی کبھی خود اپنے اشعار کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہوگا کہ یہ کیسے اور کب اسکے نوکِ قلم سے چمک اُٹھے۔ بچہ کو دیکھ کر بھی عورت اور مرد کو لگتا ہے کہ اتنی حیرت ناک چیز کے خالق وہ کیسے ہو سکتے ہیں اسی لیے تو اسے دیودوارے لے جایا جاتا ہے، اس آستانہ پر جو اس کی تخلیق کی اصل قوّتوں کی علامت ہے۔ جوشؔ بھی چاہتے ہیں کہ ایک بار تخلیق کی یہی بھید بھری قوّت یہ الہامی طاقت یہ لیلیٰ تخیل، یہ Muse یہ سرسوتی پتہ نہیں پری ہے یا فرشتہ روح ہے یہ واہمہ، آجائے انسانی شکل میں، انکے سامنے آجائے تو وہ تمام تحسین و مرحبا کے زمزمے جو اشعار، جوش پر سامعین نے بلند کیے ہیں، ان کا ہار گوندھ کر اس کے گلے میں ڈال دیں۔ ''تحسین کے پھول'' بیحد خوبصورت اور نزاکت سے لکھی ہوئی نظم ہے۔ اس میں سے کچھ چیدہ چیدہ شعر ہی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

رات کے ہنگام جب ہوتا ہے اِک عالم خموش

بادِ خواب آور سے جل اُٹھتی ہے یاں قندیلِ ہوش
کوئی پُر اسرار قوّت کوئی روحِ محتشم
شعر کہنے کو مرے ہاتھوں میں دیتی ہے قلم
دفعتاً چھڑتے ہیں پھر ارض وسما کے زمزمے
اِک کرن سی دائرے میں گھیر لیتی ہے مجھے
دل میں ہوتا ہے مرے نادر خیالوں کا ہجوم
مسکرا کر دیکھنے لگتے ہیں گردوں سے نجوم
لکھ رہا ہوں کیا نہیں ہوتی مجھے مطلق خبر
انگلیوں پر اِک جلالی شان آتی ہے نظر
یوں قلم کرتا ہے جنبش ہاتھ میں بے اختیار
اک طرب آمیز دہشت دل کے چھو لیتی ہے تار
یوں فضا میں نقش اُبھر آتے ہیں تھراتے ہوئے
جس طرح ساحر کے لب افسوں کو دُہراتے ہوئے
کس قدر اسرار سے معمور ہیں جلوے ترے
اے تحیر خیز جلوے لیلیٰ تخیّل کے
تُو پری ہو یا فرشتہ رُوح ہو یا واہمہ
آ کسی دن میرے آگے شکلِ انسانی میں آ
تا کہ میں وہ شہد بار الفاظ، وہ شیریں فضا
پنکھڑی سے وہ تبسم، وہ صدائیں دل کشا
روح پرور وہ صلے، وہ مرحبا کے زمزمے
جو بطورِ داد پائے ہیں مرے اشعار نے
سر عقیدت سے جھکا کر اے نہفتہ غم گسار

ڈال دوں گردن میں تیری گوندھ کران سب کا ہار

الہامِ شعر پر غالب اور دوسرے شعرا کے یہاں بہت اچھے اشعار دیکھنے کو مل جاتے ہیں لیکن اتنی اچھی نظم کہیں نظر نہیں آتی۔ اپنی ذات سے بڑھ کر کسی اور طاقت کا احساس جوشؔ کی رومانیت کو نرگسیت اور خود آرائی کے اثرات سے بچاتا ہے اور ان کے اسلوب اور لب ولہجہ کو غیر شخصی پن کا وہ ہلکا سا لمس عطا کرتا ہے کہ فخر ومباہات اور شاعرانہ تعلّی کے خوف کے بغیر وہ شاعر کے ذہن کی جولانیوں اور تخیّل کی کرشمہ زائیوں کا بیان اس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ ہر بڑے شاعر کے ذہن کا عکس معلوم ہوتا ہے۔ ''شمعِ فروزاں'' سے یہ چند اشعار دیکھیے:

میں اے جوشؔ اس دور میں ہوں وہ شاعر
اندھیرے میں جس طرح شمعِ فروزاں
مرا شعر اِس عصرِ بے رنگ بو میں
پسِ تیرگی جلوۂ آب حیوں
مرا دل دھڑکتا ہے یوں زیر و بم سے
جھپکتی ہے جس طرح مژگانِ دوراں
مری سادگی میں بھی وہ دل کشی ہے
شب ماہ میں جس طرح خوابِ طفلاں
مرے ذہن پر رشحۂ ابدِ معنی
جوانی کے ماتھے پہ جس طرح افشاں
بساطِ ادب پر مری طبع رنگیں
سرِ شاخ جس طرح مرغِ خوش الحاں
مری چشم تر میں تمنا کی ہیچل
سرِآب جس طرح موجِ چراغاں
مری روح پر عکس تخیل رنگیں

جبیں پر ہو جس طرح زلف پریشاں
مرا دل ہے اے جوشؔ داغوں کی ضو سے
برشتہ تر از حسنِ صحرا نشیناں

بطور شاعر کے ان میں سے ہر دعویٰ حق بجانب ہے جوشؔ کی شاعری پر بھی ہر دعوے کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ بہر حال وہ بڑے شاعر تھے۔ان میں تعلّی اس لیے نہیں کہ شاعر جن اوصاف کا ذکر کرتا ہے وہ اگر شاعر میں نہ ہوں تو اس کا دعوائے شاعری ہی بیکار ہے۔لیکن اہمیت اوصاف کی نہیں بلکہ ان تشبیہوں اور استعارات کی ہے جس کی کمند پھینک کر جوشؔ ان اوصاف کو اپنی ذات سے مختص کرتے ہیں۔ یہ تشبیہات اور استعارات خالصتاً شاعرانہ ہیں گو وہ ایسی بھی ہو سکتی تھیں جن سے خود ستائی اور مبالغہ کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ خود احتیاطی جوش کی تمام شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

جوش نے اپنے وقت کے معاشرے پر سخت تنقیدیں کی ہیں۔قومی،ملّی اور وطنی شاعروں کی طرح انھوں نے عوام کے شودنزم کو پالا پوسا نہیں۔انھوں نے عوام کے قومی اور مذہبی آدرشوں اور ماضی کی روایات اور قبائلی اخلاق کی ایسی بھٹّی نہیں کی جو انکے لیے افیون کا کام کرے۔ ہندوستانی سماج جس جہالت، پسماندگی،توہمات، مذہب زدگی اور استحصال کا شکار رہا ہے جوشؔ نے کبھی اس سے اس وجہ سے چشم پوشی نہیں کہ کہ آئندہ اشترا کی یا اسلامی سماج میں یا رام راج میں یہ خرابیاں دُور ہو جائیں گی۔آدرش وادی شاعری کی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ اس نے انسانی عظمت کے ترانے گائے لیکن جابر استحصالی اور فاشی طاقتوں کے ہاتھوں انسان اور زندگی کا Degradation نہ دیکھ سکی۔ جدید شاعری اور افسانہ کی بھی یہی مصیبت ہے کہ آدرش نہ سہی، اسطور اور علامت کی خاطر وہ اظہار و بیان کے ان اسالیب سے محروم ہوگئی ہے جو ہمارے عہد کی ہولناکیوں اور اس کے تاریک المیوں کا بیان کر سکے۔

بہر حال جوشؔ کی شاعری میں اپنے وقت کے سماج پر بے پناہ تنقید ملتی ہے۔سماج کے استحصالی طبقہ کے نمائندہ کرداروں کے چربے ہیں۔شاعر اور سماج کے رشتہ کو مختلف شاعروں نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔اکثر کلبیت کا شکار ہو کر اس دن کو کوستے تھے جب وہ شاعر

بنے۔ باؤلیئر کی ایک نہایت ہی تلخ نظم میں ماں اس Monstrosity کو کوستی ہے جو شاعر کے رُوپ میں اس نے جنا ہے۔ حالی بھی کہہ گئے ہیں کہ ماں دھوبی کا پتھر جنتی تو کپڑے دھونے کے کام آتا۔ اقبال کے یہاں شاعر اور ملّت کے کسی بھی حصہ، جسم میں ہو شاعری کی آنکھ روتی ہے۔ ترقّی پسند عوام کے نغمہ سنج ہیں لہٰذا ان کے یہاں بھی عوام سے گہری یگانگت ہے۔ بیگانگی کا کوئی احساس نہیں۔

یہ میں کہہ چکا ہوں کہ جوش کشمکش اور تضادات کے شاعر ہیں۔ جوش کے یہاں رُومانی انفرادیت پسندی اور اجتماعیت کے درمیان بھی کشمکش ہے۔ وہ جس سماج کے شاعر ہیں اس کے بور ژواژیوں کے لیے جیسا کہ والیئری نے بتایا ہے شاعری اہم نہیں ہے۔ ان کے الحاد اور دہریت نے انھیں اپنی قوم سے بیگانہ کر دیا ہے۔ وہ عوام کے توہمات، جہالیت اور مذہب زدگی کے ساجھے دار نہیں۔ لیکن انھوں نے شاعری کی دیوی کا حسن دیکھا ہے۔ تخیّل کے اعجاز اور الفاظ کی جادوگری کا تماشہ کیا ہے۔ وہ ان جلووں سے آشنا ہیں جو تخلیقی تخیّل شاعری کے رنگ منچ پر دِکھاتا ہے۔ چنانچہ انھیں شاعر ہونے کا افسوس نہیں۔ وہ اپنی ذات کو کوستے نہیں۔ شاعری پر انکا اعتماد قائم ہے۔ لیکن یہ موقعہ سماج کو پھٹکارنے کا بھی نہیں۔ ضرف دونوں کے بیچ جو تضادات ہیں انھیں ایک دردناک لیکن دل پذیر نغمہ میں بدلنے کا ہے، سعی لاحاصل، کے ان اشعار پر مجھے اپنا مضمون ختم کرنے کی اجازت دیجیے:

اے جوش تنکیوں میں پُرافشاں ہوئے تو کیا
بہروں کی انجمن میں غزل خواں ہوئے تو کیا
ہندوستاں غلام ہے 'گونگا ہے' سرد ہے
ہندوستاں میں آپ سخن داں ہوئے تو کیا
جس چرخ، تیرہ پر ہو سیہ ابر کا ہجوم
اس چرخِ تیرہ پر مہہ تاباں ہوئے تو کیاج
جو سر زمینِ شور ہو محروم رنگ و بُو

اس سر زمیں پہ ابرِ خراماں ہوئے تو کیا
موجوں نے جس کی توڑ دیا ہو صدف کا دل
اس جوئے غم میں قطرۂ نیساں ہوئے تو کیا
ہم وزن و ہم گہر ہوں جہاں زاغ و عندلیب
اس گلستاں میں مرغِ خوش الحاں ہوئے تو کیا
جس تیرگی میں ہو نہ سکندر نہ روحِ خضر
اس تیرگی میں چشمۂ حیواں ہوئے تو کیا
اندھوں سے جب پڑا ہے زمانہ میں سابقہ
اے جوشؔ آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا

☆☆☆

یادوں کی بارات اور احبابِ جوش

یعقوب یاور

(ایک)

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ کسی شخص کا اپنے بارے میں دیا گیا بیان اس کے بارے میں دیے جانے والے کسی دوسرے کے بیان کے مقابلے میں زیادہ معتبر ہوتا ہے۔ لیکن اس بات کو کلیے کے طور پر قبول کر لینا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہ کئی طرح کی گمراہیوں کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ انسانی مزاج کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بارے میں بہت کم سچ بولتا ہے۔ کبھی اس کے پس پشت انکسار ہوتا ہے اور کبھی خودستائی۔ یہی نہیں اپنے بارے میں بولتے وقت وہ نہ صرف دونوں صورتوں میں مبالغے سے کام لیتا ہے بلکہ اکثر صداقت سے یکسر انحراف بھی کرنے لگتا ہے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ ایسا غلو آمیز بیان وہ صرف اپنی خوبیوں کے بیان میں ہی روا نہیں رکھتا، اکثر اپنی برائیوں کی ڈینگ بھی مبالغے کے ساتھ ہانکتا ہے۔ مطلب یہ کہ انسانی زبان کا سچ بولنے کا رویہ، بالخصوص اپنے بارے میں، ہمیشہ ہی شک کے دائرے میں رہتا ہے۔ ویسے عام حالات میں بھی دل میں موجود کوئی خیال جب زبان کے توسط سے فہم کی دنیا میں نمودار ہوتا ہے تو اس کی شکل وہ نہیں رہ جاتی جس شکل میں کبھی وہ دل میں آیا ہوتا ہے۔ دراصل زبان سے خارج ہونے والے یہ بیانات ہمارے جذبات کے محکوم ہوتے ہیں۔ ہمارے جذبات جس قدر معمول پر ہوں گے، زبان اسی تناسب سے معمول پر رہے گی اور اس میں جس قدر اشتعال شامل ہوتا جائے گا، زبان اسی

تناسب سے مفلوج اور اظہار سے قاصر ہوتی چلی جائے گی۔ اسی کے علاوہ لازمی طور پر زبان مختلف خارجی مصلحتوں کی پابند بھی ہوتی ہے۔ اسے ہر لمحہ یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ کسی مخصوص وقت میں کسی مخصوص موضوع پر اس کے لیے کیا کہنا مناسب ہوگا اور کیا کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ ایسی سخت آزمائشوں سے گذرنے کے بعد جو باتیں سامنے آتی ہیں انھیں دل کی آواز کہنا محض اپنے آپ کو تسلی دینے جیسا ہوتا ہے۔

اظہار و ترسیل کے تعلق سے بات جب زبان کے بجائے قلم کی ہو تو معاملہ کچھ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اظہار اور ترسیل کے یہ دونوں وسیلے یعنی زبان اور قلم اپنی اپنی متعینہ حدود اور اپنے اپنے طے شدہ اختیارات کے مالک ہوتے ہیں۔ ایک طرف جہاں وسیلہ اظہار کے طور پر زبان کا امتیاز ہے کہ یہ حقیقت کا جزوی بیان کر کے سامع کے لیے متعلقہ بات کو کلی طور پر سمجھنے کا موقع فراہم کر دیتی ہے۔ وہیں قلم کی خوبی یہ ہے کہ اس کے بیانات کی عمر بیان کرنے والے کی عمر سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ دونوں کی یہ صفات انفرادی طور پر صرف انھیں کے ساتھ منسوب ہیں۔ یعنی انھیں آپس میں بدلا نہیں جا سکتا۔ دونوں کے اپنے اپنے فائدے اور اپنے اپنے نقصانات ہوتے ہیں۔ زبان کا استعمال جہاں ایک طرف اپنی آواز کے پیچ و خم کا جادو جگاتا ہے وہیں دوسری طرف انسان کے مختلف اعضائے جسمانی کے حرکات و سکنات بھی ترسیل میں معاونت کرتے ہیں اور سننے والا چند ناکافی الفاظ کے وساطت سے فہم تک کا سفر آسانی سے طے کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس قلم کے اظہار میں واسطہ محض کورے الفاظ سے پڑتا ہے۔ یہاں اظہار کے لیے ناکافی یا نامناسب الفاظ کا استعمال بات کو گنجلک یا مہمل بنا دیتا ہے۔ الفاظ کی معنوی پیچیدگیاں کبھی بیان میں ایک سے زیادہ معانی پیدا کر کے، کبھی اصل مفہوم سے انحراف کر کے حقیقت کی تلاش کے عمل کو مزید دشوار بنا دیتی ہیں۔ یہاں ترسیل کی تکمیل کے لیے انسانی اعضا کے حرکات و سکنات جیسی کوئی بھی شے قاری کی معاونت کے لیے موجود نہیں ہوتی۔ چنانچہ زبان کے مقابلے میں قلم کی ترسیل زیادہ مہمل اور زیادہ ناقابل یقین، بہ الفاظ دیگر جھوٹ سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سامع کے مقابلے میں قاری کے گمراہ ہونے کے امکانات زیادہ قوی

ہوتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال جہاں ایک طرف مذہبی صحائف کی تفہیم میں پیدا ہونے والی معنوی پیچیدگیوں اور اس کے طفیل در آنے والے باہمی اختلافات میں دیکھی جا سکتی ہے وہیں خود نوشتہ سوانح حیات بھی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

مہاتما گاندھی نے جب اپنی خودنوشت صداقت کے ساتھ میرے تجربے (My Experiments with Truth) تحریر کی تو اس میں کچھ ایسی باتیں بھی قلم کی زد میں آگئیں جو عام طور پر انسان کسی دوسرے انسان سے کہنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ کبھی اظہار اگر بذریعہ زبان سامع کے سامنے ہوا ہوتا تو شاید اتنے واشگاف انداز میں ایسا کہہ پانا ان کے لیے ممکن نہ ہو پاتا۔ مہاتما گاندھی ایک عظیم انسان تھے۔ عظیم انسانوں کی کمیوں اور کوتاہیوں کو عام طور پر ایسی تحقیر آمیز نظروں سے نہیں دیکھا جاتا جیسے دیگر انسانوں کی کمیوں اور کوتاہیوں کو دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ اکثر ایسے اعترافات ان کی عظمت کو چار چاند لگانے کا سبب بن جاتے ہیں۔ گاندھی جی کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ان کی خودنوشت پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن و دماغ میں ایک حق گو اور حق پرست کی حیثیت سے ان کی عظمت میں کچھ اور ہی اضافہ ہو گیا۔ ایسا ہونا کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ لیکن غلط یہ ہوا کہ ان کے معاصرین اور ان کے بعد آنے والی نسل کے لیے یہ ایک ایسی مثال بن گیا جس کی تقلید کو عظمت کے حصول کا وسیلہ سمجھا جانے لگا۔ اس خودنوشت کے شائع ہونے کے فوراً بعد لوگوں نے اس کی تقلید کرتے ہوئے اپنی خودنوشتوں میں حقائق یا خود ساختہ حقائق کے ایسے ایسے گل بوٹے کھلائے کہ قاری انگشت بہ دنداں رہ گیا۔ خودنوشتوں میں اپنی زندگی کے پوشیدہ اسرار طشت از بام کرنا، بالخصوص اپنے شبستانوں کے در وا کر کے پردے اٹھا دینا ایک فیشن بن گیا۔ بزبان قلم چٹخارے لے لے کر اپنے حقیقی یا فرضی معاشقوں، حسین معشوقوں اور ان سے باہمی اختلاط کا غلو آمیز بیاں جیسے خودنمائی اور تفاخر کا ذریعہ بن گیا۔ یادوں کی برات بھی گاندھی جی کے اسی طرز صداقت گوئی سے متاثر ہو کر لکھی جانے والی ایک ضخیم خودنوشتہ سوانحی تحریر ہے۔ اس میں حقائق رواج پا جانے والے فیشن کی گرفت میں اس حد تک چلے گئے ہیں کہ شاید اب اس میں سے سچ اور جھوٹ کو الگ الگ کر کے دیکھنا ممکن ہی نہیں رہ گیا ہے۔ ہم سب یہ بات بخوبی جانتے ہیں

کہ اس ضخیم جلد میں دلفریب، محیر العقول اور نا قابل یقین واقعات کی بہتات ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ جوش ملیح آبادی نے کس طرح مزے لے لے کر اپنے بچپن کی ظلم کی حدوں کو چھوتی شرارتوں، اپنی جوانی کی فحاشی کی حد تک پہنچی بے راہ رویوں اور بڑھاپے میں دردل پر ماضی کی دستکوں کے عذاب کی مبالغہ آمیز داستان قلم بند کی ہے۔ ان تمام باتوں پر یقین کرنا آسان نہیں ہے، لیکن انھیں سچ باور کرانے میں مصنف نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔

(دو)

خودنوشتوں کی اہمیت وافادیت کی بنیاد اس سچائی پر قائم ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں مصنف کی زندگی کے ایسے کوائف کا علم ہو جاتا ہے جنھیں معلوم کرنے کا کوئی دوسرا وسلیہ ہمیں میسر نہیں ہوتا۔ بے شک یہ بات صداقت پر مبنی ہے۔ لیکن اس وسیلے سے جو باتیں منظر عام پر آتی ہیں ان پر آنکھ بند کر کے یقین کرنا متعلقہ شخص کو سمجھنے میں ہماری گمراہی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ کیونکہ نفسیات کی دنیا میں اکثر اقبال جرم سے یہ ثابت نہیں ہو پاتا کہ شخص مذکور سے واقعی وہ جرم سرزد بھی ہوا ہے، جس کا اقبال اس نے برسر عام کر لیا ہے۔ جوش کے معاملے میں تو یہ بات ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اپنی خودنوشت 'یادوں کی برات' میں اس نے ایسا خوب خوب کیا ہے۔ خصوصاً اپنے معاشقوں کے بیان میں تو وہ جیسا بے لگام ہوا ہے اس پر من وعن یقین کر لینا اپنی خود اعتمادی کھو دینے جیسا لگتا ہے۔ ان بیانات سے مصنف کی جو شبیہ ابھرتی ہے، وہ اس کی اصل شکل ہوگی، اس میں شک ہے۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ خودنوشت کا مصنف اپنے بے شمار دوستوں میں سے جن مخصوص دوستوں کا انتخاب کرتا ہے اور ان دوستوں کی بے شمار صفات میں سے جن کا بیان ضروری سمجھتا ہے، اس سے خود مصنف کی دلچسپیوں اور اس کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جوش ملیح آبادی جیسے پر جوش، ولولہ خیز اور جذباتی انسان میں، جو اتفاق سے لفظوں کا جادوگر بھی ہے، یہ خوبی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ چنانچہ یادوں کی برات میں جہاں ہم جوش کے بیان کردہ واقعات وسوانح

کی بنیاد پر ان کے مزاج و ماحول کا اندازہ لگا سکتے ہیں وہیں ان کی اس نفسیات کی بازیافت بھی ان کو سمجھنے میں ہماری معاونت کر سکتی ہے۔ اور اس کی بنیاد پر اخذ کیے گئے نتائج جوش کے بیان کردہ حقائق کی بنیاد پر اخذ کردہ نتائج کے مقابلے میں زیدہ معتبر بھی ہوں گے۔

یادوں کی برات جہاں ایک طرف جوش ملیح آبادی کے سوانح حیات کا تذکرہ ہے وہیں دوسری جانب ہندوستان میں مغل تہذیب کی زوال آمادگی اور اختتام کا نوحہ بھی ہے۔ اس ضخیم کتاب کے ہر صفحے میں اودھ کے تہذیبی و سیاسی زوال اکا وہ منظر نامہ بھی سانسیں لے رہا ہے جو کسی نہ کسی بنا پر اب بھی پردہ اخفا میں رہ گیا ہے۔ یہاں اس تہذیب کے زوال کے اسباب و علل کی بھی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔ یہاں ایسے ایسے تاریخی حقائق موجود ہیں جو ہماری روایتی تاریخ کا حصہ کبھی نہیں بن پائے۔

اس کے علاوہ جوش نے اس خودنوشت میں نثری اظہار کا جو طریقہ اپنایا ہے وہ منفرد بھی ہے اور ان کی ادبی و شاعرانہ عظمت کا عکاس بھی۔ خودنوشت کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ذہن و دماغ میں فصیح و بلیغ، نرم و نازک اور رواں دواں الفاظ کا ایک دریا موجزن ہے۔ یہ مختصر مضمون ان کی نفسیات کے محض ایک مخصوص پہلو کو گرفت میں لے کر ان کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش ہے۔

(تین)

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس مضمون کا مقصد طویل عرصے سے چلی آرہی جوش مخالف تحریک کو تقویت دینا ہرگز نہیں ہے۔ شاعر کی حیثیت سے میں ان کا مداح اور ان کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوں۔ کیونکہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ جوش لکھنو کی اس تہذیبی اور شعری وراثت کا امین ہے جس میں خیال کے مقابلے اظہار خیال کی اہمیت بڑھی ہوئی تھی۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ وہ اس سلسلہ اظہار کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس زاویے سے ان کا قد میر انیس سے بھی نکلتا ہوا ہے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ جوش الفاظ کا ایسا جادوگر ہے جسے ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ میں

باندھنے کا ہنر میر انیس سے کہیں بہتر آتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیدہ مناسب ہوگا کہ اظہار کا یہ انداز اس کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ جوش اپنی شاعری میں جس طرح الفاظ کا دریا بہاتا ہے وہ اچھے اچھوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں نہ تو جوش ملیح آبادی کو 'شاعر آخرالزماں' تسلیم کرنے کو تیار ہوں اور نہ اسے 'الفاظ کا کباڑ گھر' کہے جانے کا سزاوار سمجھتا ہوں۔ مجھے اس بات سے بھی کچھ لینا دینا نہیں ہے کہ جوش اقبال سے بڑا شاعر ہے یا اس اس سے چھوٹا۔ کیونکہ مجھے یہ سب بے سر پیر کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جوش دشمنی کا سارا طوفان اور ان کی مخالفت کی جڑیں کہیں اور ہیں اور ان کا تنقید شعر وادب سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ آٹھ دہائیوں سے ہمارے ناقدوں کا یک معتد بہ حصہ ان کے ساتھ مسلسل نا انصافی کرتا چلا آرہا ہے۔ ان کی تحقیر کے لیے کبھی ان کا موازنہ اقبال جیسے دوسری دنیا کے شاعر سے کیا جاتا ہے تو کبھی انھیں لغات کا شاعر کہہ کر اس طرح بے حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسے لغات کے علم کی شاعری میں کچھ اہمیت وافادیت ہی نہ ہوتی ہو۔ جیسے الفاظ سے شاعری کا رشتہ رفاقت کا نہیں عداوت کا ہو۔ اور بہ فرض محال اگر یہ بات درست ہو بھی تو صرف جوش ہی پر یہ عتاب کیوں، اس کے ساتھ تو لکھنو کی ساری شاعری پر ہی سوالیہ نشان لگانا ہوگا۔

نثر ہو یا نظم، زبان جوش کی سب سے بڑی قوت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ کسی تجربے کے بیان سے وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک جی بھر الفاظ کا دریا نہ بہا لے۔ جوش کی تحریروں سے لوگوں کو عام طور پر یہ شکایت ہے کہ جب وہ قاری کو الفاظ کے سیل میں بہالے جاتا ہے تو اکثر خود بھی اس بہاو کی نذر ہوتا جاتا ہے۔ پھر نہ اسے اپنے قلم پر قابو رہ جاتا ہے اور نہ دماغ پر۔ اور جب تک وہ ہوش میں آتا ہے اور اپنے آپ پر قابو پانے کا کوئی سہارا تلاش کرتا ہے اس وقت تک خیال کی ڈور اس کے ہاتھ سے پھسل چکی ہوتی ہے۔ یہ خیال آرائی درست نہیں ہے۔ جہاں تک الفاظ کے سیل میں قاری کو بہالے جانے کی بات ہے، یہ عمل صدیوں سے اظہار کا سب سے بلند معیار رہا ہے اور آج بھی اس کی اثر پذیری اور ہردلعزیزی میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ چنانچہ اسے جوش کی خوبی کی حیثیت سے دیکھا جانا چاہیے نہ کہ خامی کی حیثیت سے۔ اور

جہاں تک اپنے پیدا کردہ سیل میں خود بہہ جانے کی بات ہے، تو یہ خامی ناقد کی حاشیہ آرائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی بھی تحریر، خاص طور پر تخلیقی تحریر چاہے، اس کا تعلق نثر سے ہو یا نظم سے، جذبات کی تابع ہوتی ہے۔ اس بات کو مصنف کے لیے بہتر تصور کیا جاتا رہا ہے کہ وہ اپنی تحریر میں ڈوب جائے۔ تحریر پر جذبات کا غلبہ کبھی کم ہوتا ہے کبھی زیادہ لیکن اس وقت تک اسے خامی تصور نہیں کیا جا سکتا جب تک اظہار مطالب میں کوئی کجی یا گمرہی داخل نہ ہو جائے۔ جوش جذباتی انسان ہیں۔ ان کی ہر تحریر میں ایک طرح کا والہانہ پن موجود ہوتا ہے۔ لیکن اس کو خامی کی طرح پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس کی نثر قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں پوری طرح کامیاب رہتی ہے۔

(چار)

جوش کی شاعرانہ عظمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اب ہم اس حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یادوں کی برات میں اپنے احباب کے بیان میں جوش ملیح آبادی کی اپنی شخصیت کتنی پوشیدہ اور کتنی نمایاں ہے۔ اور اس شخصیت کو منکشف کر کے ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس میں اصل جوش کہاں چھپا ہوا ہے۔

یادوں کی برات میں جوش نے اپنے تینتیس احباب کا ذکر کیا ہے، جن کے اسمائے گرامی کچھ اس طرح ہیں۔ (۱) ابرار احمد خاں اثر ملیح آبادی، (۲) مختار احمد خاں، (۳) قاضی خورشید احمد، (۴) حکیم صاحب عالم، (۵) رفیع احمد خاں، (۶) پرنس میرزا عالم گیر قدر، (۷) مولانا سہا بھوپالی، (۸) ڈاکٹر ایس کے سکینہ، (۹) مانی جائسی، (۱۰) منے میرزا شرر لکھنوی، (۱۱) شاہ دلگیر اکبر آبادی، (۱۲) نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی، (۱۳) حکیم آزاد انصاری، (۱۴) فانی بدایونی، (۱۵) آغا شاعر قزلباش، (۱۶) سردار سروپ سنگھ، (۱۷) وصل بلگرامی، (۱۸) ڈاکٹر کرنل اشرف الحق، (۱۹) کنور مہندر سنگھ بیدی، (۲۰) پنڈت جواہر لال نہرو، (۲۱) سروجنی نائڈو، (۲۲) میاں محمد صادق، (۲۳) علامہ حیرت، (۲۴) سردار دیوان سنگھ

مفتوں، (۲۵) مولانا عبدالسلام، (۲۶) مولانا عبداللہ عمادی، (۲۷) فراق گورکھپوری، (۲۸) وحیدالدین سلیم، (۲۹) سید جالب دہلوی، (۳۰) روشن علی بھیم جی، (۳۱) آغا حسن عابدی، (۳۲) مصطفیٰ زیدی اور (۳۳) مجاز۔

ان احباب میں سے کچھ ان کے رشتہ دار اور پڑوسی جن سے لڑکپن ہی میں قربت ہوگئی تھی اور کچھ ایسے دوست ہیں جو سفر حیات کے مختلف مراحل میں ان سے ملے اور ان کے قریب آئے۔ ان میں سے ان کے اکثر احباب عام انسانوں جیسے نظر نہیں آتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کسی فوق البشر کی طرح دکھائی دیتے ہیں، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ اپنی ابلیسیت میں اس حد تک رنگے نظر آتے ہیں جیسے ان کا حضرت آدم سے کوئی رشتہ ہی نہ رہا ہو۔ اگر ہم جوش کے بیانات پر بھروسا کریں تو ان کے اکثر دوست خلاف معمول نفسیات (Abnormal Psychology) کی گرفت میں اور تہذیب و تمدن مخالف سرگرمیوں میں ملوث دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ان احباب سے جن خصوصیات کو منسوب کیا ہے وہ بیشتر منفی ہیں اور عام طور پر معاشرہ ایسی صفات کے حامل کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ ان شخصیات کے اندر یقیناً کچھ مثبت خصوصیات بھی ہوں گی، لیکن جوش نے ان کے بیان سے شعوری احتراز کیا ہے۔ شاید جوش اپنی اس کتاب کے ہر واقعے کو ایسی خبر بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا جو دلچسپ بھی ہو اور قاری کی امیدوں اور اندازوں سے بلند بھی۔ معمول کے مطابق رونما ہونے والے واقعات میں دلچسپی اور تجسس کا فقدان ہوتا ہے۔ جب کہ خلاف معمول واقعات لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جوش کے سامنے نفسیات کا یہ رمز بخوبی واضح تھا۔ انھوں نے حقائق کے بیان کے مقابلے میں قاری کے لیے تفریح دلچسپی کا سامان فراہم کرنے کی جانب زیادہ توجہ دی ہے۔ جب ہم جوش کی اس منشا کا سراغ لگا لیتے ہیں تو یہ بات خود بہ خود طے ہو جاتی ہے کہ جوش کے بیان کردہ اِن واقعات کی صداقت مشکوک ہے۔

اس کتاب میں مذکور جوش کے احباب کو ہم بہ آسانی دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان احباب کی ایک قسم وہ ہے جن سے جوش کے بے تکلف روابط ہیں اور جو ان کے ہم نوالہ رہے

ہیں۔ دوسرے وہ احباب ہیں جن سے جوش کا رشتہ احترام وعقیدت کا رہا ہے۔ اول الذکر کے بیان میں جوش کے بے لگام ہو جانے کی مثالیں اس کتاب میں جا بہ جا بکھری ہیں لیکن ثانی الذکر کے بیان میں جوش کسی حد تک محتاط ہیں۔ حالانکہ ان کی ظرافت کی فطرت یا شرارت یہاں بھی گل کھلائے بغیر نہیں رہتی۔ یہاں صرف ان کے چند ایسے جملے ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے اس کتاب میں اپنے دوستوں کو متعارف کرانے کی غرض سے لکھے ہیں۔

> چڑھتی عمر میں سراپا نیاز، ڈھلتی زندگی میں خوف ناک دشنام طراز، اور میرے اس کوچے کے راہ براولیں تھے، جس کو بدتوفیقوں کی اصطلاح میں کوئے بداعمالی کہا جاتا ہے۔

(ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی)

> ریاضی کے استاد، شاعرونقاد، فارسی وسنسکرت کے ماہر، مکذب بدیہیات، طفل حرکات، اخلاص شعار، دوست نواز، دشمن ناشناس، امرد پسند، آداب شکن، سریع الکلام، آشفتہ مزاج، غریب الخصائل، بظاہر بیگانہ، بباطن یگانہ۔

(قاضی خورشید احمد)

> تمام دنیا کے نخش نگاروں کے سلطان، علی گڑھ کے گولڈ میڈلسٹ ایم اے، متعدد کالجوں کے پروفیسر، آخری دور میں لکھنو کوآپریٹیو سوسائٹی کے سکریٹری، متوسط القامت، شگفتہ پیشانی، تاش استاد، سدا بشاش، چوک رسیا، پدر معتوب، شہر محبوب، جوانی میں امرد پرستار، زوال جوانی میں طوائف گرفتار، مرنجان مرنج قسم کے دل موہ لینے والے انسان تھے۔

(رفیع احمد خاں)

> نہ دبلے نہ دھم دھوسڑ، مزاج میں ذرا سی گڑبڑ، چہرے کا ملگجا سا گونگا رنگ، لہجے میں بجتا چنگ، بدمزاج بیوی کے صید زبوں، وہ ظالم لیلیٰ یہ مظلوم مجنوں۔ آنکھیں ذہانت سے ضیا بار، معقولات کے علم بردار، فلسفے کا افتخار،

منطق کا وقار، کاہلی کے پرستار اور بزدلی کے مہا اوتار۔

(ڈاکٹر ایس کے سکسینہ)

اس کرہ ارض پر معلومات عامہ کا اس قدر بڑا کباڑی اور کوئی موجود نہیں ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ جہاں تک علم و آگاہی کا سوال ہے۔ آسمان پر خدا قدیر ہے اور زمین پر میرزا عالم گیر ہیں۔ وہ عرش پر علام الغیوب ہے یہ فرش پر علام الشہود ہیں۔

(پرنس میرزا عالم گیر قدر)

گورے رنگ اور متوسط قامت کے، خوش رو، بدگمان، سریع الغضب، خدمات فراموش، پریشاں روزگاری میں کامل دوست، فراغت میں قطعی اجنبی، اوہام کی حد تک راسخ العقائد، بدرجہ اتم نکتہ سنج، قیامت کے ذہین، نہایت خوش فکر غزل گو، بلا کے عاشق مزاج اور ایسی رحم انگیز دردمندی سے غزل پڑھنے والے انسان تھے کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو صبح ازل سے شام ابد تک ۔ ابر پھٹتا ہی چلا جاے گا، اور لہجے میں ایسی دلکش موسیقی تھی کہ بات کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طبلے پر بول کٹتے چلے جا رہے ہیں۔

(مانی جائسی)

حضرت عزیز لکھنوی کے قابل ناز شاگرد، مجھ ہیچمداں کے استاد بھائی، علم عروض و فن شاعری کے مرکزی استاد، فارسی و انگریزی کے زبردست نباض، قلزم انسانیت کے منارہ ضوبار، ممبر انتقاد کے خطیب اعظم، مسند زبان کے قاضی القضات اور مدینہ تہذیب لکھنو کے طاق زریں کے ہزاروں بجھے ہوے چراغوں کی قطاروں میں ایک ایسے آخری اور تنہا چراغ تھے جس کے گل ہو جانے سے تمام شہر پر مہیب اندھیرا محیط ہو کر رہ گیا ہے۔

(نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

اب ایک واقعہ ایسے دوست کا بھی سن لیجیے جن سے جوش کے بقول ان کا احترام کا رشتہ تھا۔ لکھنو کے حاذق و ممتاز طبیب، عربی و فارسی کے منتہی، مذہبی قصائد کے عدیم النظیر شاعر، یتیموں اور بیواؤں کے سر پرست، مملکت شرافت کے تاجدار، اقلیم خلوص کے شہر یار اور کاروان زہد و اتقا کے سالار۔۔۔ خوش رو، خوش وضع، خوش فکر، خوش اخلاق، خوش پوشاک، خوش گفتار، خوش تبسم، خوش اوقات، خوش مدارت، خوش میزبان اور خوش مطبخ۔ حکیم صاحب عالم کے بارے میں ایک موقعے پر فرماتے ہیں:

''رئیس نے تانگہ منگایا، اس پر چادر باندھی، مجھے اندر بٹھایا، خود کوچ بان کے قریب بیٹھے، تانگہ حکیم صاحب کے مطب کے پھاٹک پر رکا، اندر گئے، حکیم صاحب سے کہا، ملیح آباد کی ایک خاتون کو کئی روز سے بخار آرہا ہے، میں انھیں تانگے میں لایا ہوں، آپ کو تکلیف نہ ہو تو مہربانی فرما کر ان کی نبض دیکھ لیں۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھنے کے لیے پردے میں ہاتھ ڈالا اور میں نے ان کے ہاتھ میں۔۔۔ تھما دیا۔ وہ اچھل گئے اور 'ارے' کہہ کر اس زور سے ہاتھ باہر کھینچا گویا ان کا ہاتھ بجلی کے برہنہ تار سے مس ہو گیا ہو۔

بہ طور مثال یہاں پیش کیے گئے یہ چند تعارفی کلمات اور حکیم صاحب عالم کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعے سے جہاں ایک طرف اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ زبان پر جوش کی گرفت مضبوط ہے اور الفاظ کے بہترین استعمال کے ساتھ ساتھ نتیجے کے طور پر رونما ہونے والی ان کی جادو بیانی پر دلالت کرتے ہیں۔ وہیں ان کی شرافت اور رذالت کے درمیان حد فاصل کھینچنے میں بھی مدد ملتی ہے، جو ایسی حدوں میں داخل نظر آتی ہی، جوش کی نظر میں بھلے ہی شرافت کے دائرے میں آتی ہو لیکن عام طور پر اسے رذالت ہی سمجھا جائے گا۔ یہاں وہ توازن بھی مفقود نظر آتا ہے جو کسی عام انسان کا خاصہ ہوتا ہے۔ ایسی مثالیں اس ضخیم کتاب میں جا بہ جا بکھری پڑی ہیں۔ ان مثالوں اور ان شخصیات کی دیگر تفصیلات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کے بیشتر احباب نفسیاتی طور پر یا تو صحیح المزاج نہیں تھے یا جوش نے ان کی جس شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اس میں مبالغہ ادبی حدود سے متجاوز ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ کہ لوگ سچ مچ ایسے ہی رہے

ہوں گے جیسا کہ جوش نے انھیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، تو پھر ہمیں اس بات پر بھی یقین کر لینا ہوگی کہ ان کے علاوہ جوش خود بھی خلاف معمول (Abnormal) عادات واطوار کے مریض تھے۔ اسی سبب وہ ایسے ہی دوستوں کا انتخاب کرتے تھے جو ان کے ہم مزاج ہوں۔

(پانچ)

اختصار کے ساتھ ہی سہی، اب ذرا اس اجمال کی کچھ تفصیلات بھی دیکھ لیتے ہیں۔ یہاں کتاب میں مذکور تینتیس احباب کی تفصیلات فراہم کرنا تو ممکن نہیں ہوگا لیکن ان میں سے چند کی تفصیلات بھی پیش کردی جائیں تو شاید بات واضح ہو جائے گی۔ احباب کی فہرست میں پہلا نام ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی کا ہے۔ اس کتاب میں ان کی جن صفات عالیہ کا احاطہ کیا گیا ہے، ان میں مسلمانی لڑانے کے شوق، بوڑھی ملازمہ کو اوندھی ہو جانے کا حکم، خوب صورت لڑکوں کے ساتھ جنسی رشتے استوار کرنے کا مزاج، باپ کے محافظ بوڑھے سپاہی کو بے سبب ماں کی گالی دے کر اسے آنسو بہانے پر مجبور کرنے کی خوش فعلی، دوست سے اس کی جمع کردہ گنیاں اینٹھنے کے لیے اسے صحت بنانے کی دوا کے طور پر معمولی روغن بادام فراہم کر کے کہنا کہ یہ زبان کا طلا ہے، جیسی متعدد کرتو تیں اور ان کی شکایت ہونے پر اپنی حاضر جوابی کے طفیل سزا سے بچ جانے کی تفصیلات شامل ہیں۔ جوش کے دوسرے دوست مختار احمد خاں ہیں جنھیں وقت بے وقت ہنسنے اور قہقہے لگانے کی بیماری لاحق ہے۔ خاص طور پر جب یہ کسی معزز مذہبی شخصیت کو دیکھتے ہیں تو انھیں بے اختیار ہنسی آنے لگتی ہے۔ لیکن انھیں حضرت کو اپنی محبوبہ سے ملاقات ہونے پر اس کے سامنے رونے کی بھی بیماری لاحق ہے۔ رونے کی یہ بیماری ان کے کچھ اور دوستوں میں بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر مانی جائسی کو جب جوش ان کی پسندیدہ طوائف فراہم کردیتے ہیں تو وہ تنہائی میسر آتے ہی ان کے پیر دبانے لگتے ہیں اور ساتھ ساتھ روتے بھی جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ جوش چپ چاپ چھپ کر یہ تماشا دیکھ بھی رہے ہوتے ہیں۔ جب جوش کمرے کے اندر جا کر انھیں یاد دلاتے ہیں کہ اس طوائف کو کسی اور مصرف سے طلب کیا گیا تھا۔ تو وہ چونک کر اصل کام کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، لیکن ان کا رونا پھر بھی بند نہیں ہوتا۔ قاضی خورشید احمد بھی جوش سے

ایک دوست ہیں جن کا ذکر انھوں نے مزے لے لے کر کیا ہے۔ ان کا شمار ایک طرف ماہرین ریاضی میں ہوتا ہے تو دوسری جانب وہ خوش گو شاعر اور شاعری کے نقاد بھی ہیں۔ ان کی عادت ہر بات کو تین بار دوہرانے کی ہے۔ مثلاً آپ مہربانی فرما کر ایران تشریف لے جائیں، ایران ایران ایران۔ یا پھر یاددہانی یاددہانی یاددہانی تو چھوٹوں کو کی جاتی ہے وغیرہ۔ یہ صاحب بدتمیزی کی حد تک پہنچے ہوے خوش گفتار ہیں اور شرفا کی محفلوں میں انھیں لے جانا اپنی توہین کرانے کے مترادف ہے۔ یہ حضرت اکثر مواقع پر جوش کے لیے بھی شرمندگی کا سبب بن جاتے ہیں۔ ایک اور دوست رفیع احمد خاں ہیں جو اکثر 'تلاش معاش' یعنی جستجوے لالہ رخاں میں مصروف رہتے ہیں، 'دلیل ڈنڈاوی' سے خدا کے وجود کو ثابت کرنا جانتے ہیں، فحش نگار ہیں، جلوس خرام و دشنام' کے موجد ہیں اور ان تمام باتوں کی بے یقینی کی حدوں تک مس کرتی ہوئی تفصیلات ہیں۔ محکمہ اطلاعات ونشریات کے ڈائرکٹر ایس کے سکسینہ ہیں جو ناقبل یقین حد تک بزدل اور کاہل ہیں۔ مولانا سہا مجددی بھوپالی ہیں، جو زبردست عالم ہیں۔ اتنے پستہ قد کہ ان کی بیوی جب ناراض ہوتی ہیں تو انھیں گود میں اٹھا کر طاق پر بٹھا دیتی ہیں اور یہ چلاتے رہ جاتے ہیں۔ ان حضرت کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی کو ماں کی گالی سے نوازتے رہتے ہیں۔ امیر نہیں ہیں لیکن طوائفوں سے قربت حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔

جوش کے احباب میں سے چند کی تفصیلات مختصراً یہاں وہاں سے لے کر بلا انتخاب درج دی گئی ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی تفصیلات ان احباب کے بارے میں بھی ہیں جن کا ذکر طوالت سے بچنے کے لیے یہاں نہیں کیا گیا ہے۔ انھیں پڑھ کر بھلا اس کے علاوہ زبان سے اور کیا نکل سکتا ہے کہ واہ رے جوش اور واہ رے تیرے احباب۔ ان تمام لوگوں کی مثبت صفات کو جوش نے درج کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احباب کا یہ یک طرفہ بیان ان حضرات کی شخصیت کو مجروح کرنے کا سبب بن گیا ہے۔

(چھ)

احباب جوش کے اس تذکرے کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ

ایک طرف جوش کی سبک اور دل نشین نثر اور واقعات کا لطیف اور ظریفانہ انداز بیان سامان تفریح فراہم کر رہا ہے تو دوسری جانب وہ خود کو اس بات پر بھی یقین کرنے کے لیے مجبور پاتا ہے کہ جوش نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سب سچ نہیں ہوسکتا۔ حقیقت کے بیان کو دلنشین اور دلفریب بنانے کے لیے افسانوی انداز بیان معاون تو ہوسکتا ہے لیکن یہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے جہاں ہر لمحہ حقیقت کے کٹ کر گر جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ یہاں جوش حقیقت کو حقیقت بنائے رکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ بیوی کے علاوہ کسی سے جھوٹ نہ بولنے کا مدعی جوش یہاں دروغ گوئی کا مرتکب ہی نظر نہیں آتا ہے بلکہ اس کا عادی بھی معلوم ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود جوش کی زندگی سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید اور اکارآمد بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اس کے مطالعے سے جوش کے پس پردہ پوشیدہ مزاج کا سراغ ملتا ہے۔ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کے دل میں جہاں ایک طرف انسانیت سے ہمدردی کا سمندر موجزن تھا وہیں وہ انسانوں پر مظالم کو بھی روا رکھتا تھا۔ وہ ایسا دوست نواز تھا کہ اگر اسے دوست کی کسی ضرورت کا احساس ہو جائے تو بھلے ہی یہ ضرورت ناجائز ہو، وہ اسے پوری کرنے کے لیے جی جان سے لگ جاتا تھا۔ اپنی بے راہ رویوں کی ڈینگ ہانکنا، چاہے دو بہ دو ہو چاہے بہ زبان قلم، اس کی عادت ثانیہ تھی۔ جنسیات کے بارے میں اس کا نقطہ نظر معاشرے میں رائج نظریے سے متصادم تھا۔ وہ اگر کسی سے خوش ہو جائے تو اسے اس دنیا میں ہی جنت کے دیدار کرا سکتا تھا اور اگر کسی سے ناراض ہو جائے تو اس کے زندگی کو سراپا عذاب بھی بنا سکتا تھا۔ یہ اور ان جیسی متعدد باتیں یادوں کی برات کے بین السطور موجود ہیں جنھیں دوران مطالعہ بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

یادوں کی برات میں ہمیں اس عہد کے طبقہ امرا کے شب و روز کی وہ جھلک بھی دکھائی دیتی ہے جسے دیکھنا کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ اس عہد کے نام نہاد شرفا کا مزاج عجیب وغریب تھا۔ ان میں برے عادات واطوار فطری طور پر پیدا ہو جایا کرتے تھے۔ ایسے کہ انھیں ان کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ ایسا شاید اس لیے ہوتا تھا کہ ان کے مزاج کی تشکیل میں ان

کے معاشرے کے دوسرے افراد کا کوئی کردار ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ طبقہ امرا کی بد اعمالیوں پر کسی طرح کا تبصرہ کرنے کی نہ تو معاشرے کو اجازت تھی اور نہ کوئی اس کی جرات کر سکتا تھا۔ رہے گھر کے بڑے بزرگ، تو وہ خود بھی اسی ماحول کے پروردہ ہوتے تھے۔ شاید انھیں اتنی مہلت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ بچوں کی تربیت پر خاطر خواہ توجہ صرف کرسکیں۔ اور اگر کبھی ان کے پاس بچوں کی کوئی شکایت پہنچتی بھی تھی تو وہ اس پر اتنے سنجیدہ نہیں ہوتے تھے جتنی ان کی اصلاح کے لیے ضروری ہوتی تھی۔ ان کا عمومی خیال یہ ہوتا تھا کہ 'اب امیر زادے یہ سب نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا'۔ چنانچہ بد اعمالیاں ان کے مزاج کا حصہ بنتی چلی جاتی تھیں۔ جوش کا اپنی بے راہ رویوں اور بد اعمالیوں کا بے محابا اور فخریہ بیان اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ خود بھی مکمل طور پر اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کہنے کو تو وہ کھلے دل ودماغ کے ترقی پسند انسان تھے لیکن اپنی ذاتی اور نجی زندگی میں وہ ہمیشہ اسی مزاج کے ساتھ زندہ رہے جو ان کا، ان کے خاندان کا اور امرائے اودھ کا خاصہ تھا۔ ان کے دوستوں کی فہرست میں وہی درج ہو پاتے تھے جو ان کے اس مزاج سے مطابقت رکھتے تھے۔

آخر میں اس مضمون کا اختتام جوش کے اس اعتراف کے ساتھ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ:

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں۔۔۔۔۔۔ تھا کیا؟ شعلہ تھا کہ شب نم؟
حدید تھا کہ حریر؟ نوک خار تھا کہ برگ گل؟ خنجر تھا کہ ہلال؟ چنگیز خاں کا
علم بردار تھا کہ رحمتہ اللعالمین کا پرستار؟

☆☆☆

جوش کی شاعرانہ عظمت

شاہد ماہلی

جوش ملیح آبادی بیسویں صدی کے اُن عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی انقلابی شاعری سے الگ پہچان بنائی ۔ جوش نے ایک طویل دور میں جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے ۔ ہمارے ادبی، سیاسی وسماجی رجحانات کو اپنی شاعری کے ذریعہ متاثر کیا ہے ۔ جوش کی شخصیت اس اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ انھوں نے قدیم جاگیردارانہ نظام کے برخلاف نئے سوشلسٹ نظام سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے ۔ جوش شروع سے آخر تک مشترکہ قومیت اور متحدہ ہندوستان کے حامی رہے اور جب وہ ۱۹۵۵ء میں پاکستان چلے گئے تب بھی ایسا نہیں تھا کہ ان کا نقطۂ نظر بدلا ہو ۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس وقت کی سیاسی اور معاشی فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ۔ جوش کی شاعری خوبصورت ترکیبوں، حسین تشبیہوں اور استعاروں سے بھری پڑی ہیں ۔ ان کو نہ الگ الگ خانوں میں بانٹ دینے سے کام چلتا ہے اور نہ ہی محض بصری، سمعی اور لمسی پیکر کہہ دینے سے ۔ انقلاب جوش کی شاعری کا ایک نہایت اہم موضوع تھا ۔ وہ خود بھی اسی انداز میں سوچتے تھے اور وقت کا دھارا بھی ذہنوں کو اسی سمت بہائے لئے جارہا تھا ۔ جوش کی شاعری میں ہمیں ان کا باغیانہ مزاج بھی دکھائی دیتا ہے ۔ بغاوت کا میلان بھی ان کے اندر بچپن سے ہی ملتا ہے ۔ بغاوت کا یہ میلان ان کی شخصیت میں کئی روپ میں ظاہر ہوتا ہے ۔ جوش کے بچپن کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ باپ کی مخالفت کے باوجود شاعری سے دست بردار نہ ہوئے اور باپ سے اجازت بھی لے لی ۔ جائداد کی پرواکئے

بغیر اپنے آبائی سنّی مسلک کو ترک کر کے شیعہ مسلک اختیار کیا اور پھر الحاد کی طرف بڑھے۔ جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی کھل کر مخالفت کی جو انگریز دشمنی کی صورت میں واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ مالی منفعت کے لئے حیدرآباد سے منسلک ہوئے، پھر بغاوت ہی کے سبب وہاں سے شہر بدر بھی ہوئے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آزادی ملنے کے بعد ماتمِ آزادی نظم لکھی، جس سے بے اطمینانی ظاہر ہوتی ہے۔ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان گئے وہاں متنازعہ شخصیت بنے رہے اور حکومت کے عتاب کا شکار بھی ہوئے۔ جوش کی شاعری اور ان کے عتاب پر نظر ڈالی جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ انھوں نے جگہ جگہ اسلام اور مولویوں کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ ان کے بہت سے اقوال الحاد کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک متنازعہ پہلو ہے۔ اسی لئے تو بسمل سعیدی نے اپنی ایک رباعی میں کہا ہے:

الحاد کے زینے سے اتر لیتا ہے جوش
دامانِ مراد یوں بھی بھر لیتا ہے جوش
زردار مسلمانوں کی خلوت میں کبھی
اللہ کا اقرار بھی کر لیتا ہے جوش

''یادوں کی برات'' میں انھوں نے بچپن کے جو واقعات قلم بند کئے ہیں ان میں بھی انہیں خواہشات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً بچوں کو درس دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنا پڑھا ہوا سبق بچوں کو پڑھاتے، دوسرے دن سبق سنتے اور جو نہ سنا سکتے ان کی پٹائی کرتے۔ یہی حال آگے چل کر انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں بھی کہا۔ جن کو ان کی شاعری پسند نہ آتی وہ ان کے طنز کا نشانہ بنتے اور اسے انھوں نے گونگا، بہرہ اور جاہل تک کہہ ڈالا:

اندھوں سے جب پڑا ہو زمانے میں سابقہ
اے جوش آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا
صد حیف مجھ کو قدرت سے ملا ہے یہ حکم

بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

ایک مفکر کی حیثیت سے جوش کی نظر میں حیات و کائنات کے مختلف پہلو ایک متضاد کیفیت کے حامل نہیں ہیں اور نہ ہی باہمی ٹکراؤ ان کا مقصد ہے بلکہ وہ انھیں ایک دوسرے کی تشکیل و تکمیل کرنے والے عناصر سمجھتے ہیں اور اسی نظریے پر اپنے فکر و نظر کی بنیاد رکھتے ہیں۔ جوش کی نگاہ پورے عالمِ شہود اور مکمل کائنات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ نقطۂ نگاہ جہاں اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور کسی بھی سوچنے والے دل و دماغ کو صرف تعمیر اور ارتقاء کے لغوی مفہوم ہی سے آگاہ نہیں کرتا بلکہ اس کے دوررس نتائج سے بھی آشنا کرتا ہے۔ مثلاً ایک نظم میں جس کا عنوان ہے ''میرے اجزائے فکر'' جوش کہتے ہیں:

میرا یہ نام ہے جو ذرا سا، اِس امر میں
شامل فقط زمیں ہی نہیں آسماں بھی ہے
اِس منزلت میں مرحمتِ ملحداں کے ساتھ
کچھ عنصرِ نوازشِ روحانیاں بھی ہے
تنہا نہیں نوازشِ روحانیاں کی بات
فیضانِ اشتراکِ خراباتیاں بھی ہے

جوش کی شاعری میں ان کے مرثیوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے مصائب اور گریہ کے بجائے شجاعت، ایثار اور حق گوئی جیسی عظیم انسانی قدروں کو اپنے مرثیے میں مرکزیت عطا کی ہے اور مرثیہ گوئی کا مزاج بدل دیا۔ ''حسین اور انقلاب'' کے چند بند ملاحظہ ہوں:

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم
دشتِ ثبات و عزم ہے دشت بلاد و غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم
اِس راہ میں صرف اِک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے

جس سورما کا اسمِ گرامی حسین ہے

جوش کربلا میں اس انسان کی تلاش وجستجو میں سرگرداں تھے جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا اور جس کا وجود ''عدل ومساوات کی مراد'' تھا جو ''امن کا کردار'' تھا اور عزم بشر کی بے مثال یادگار تھا۔ جوش نے اپنی شاعری میں انسانی عظمت کی طرف بھی کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ جس انسانی عظمت کا ذکر جوش نے اپنی شاعری میں کیا ہے اس کو پڑھ کر ہمیں ان کی عظمتِ شاعری کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جوش بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا۔ بعد میں انھوں نے غزل گوئی ترک کردی۔ نظم نگاری کو ذریعۂ اظہار بنایا، غزل کے مخالفین میں شامل ہوگئے اور ایک ممتاز نظم نگار کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی۔ ان کے فوراً بعد کی نسل نے ان کے گہرے اثرات قبول کئے۔ غزل کی مخالفت میں انھوں نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا لیکن ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ غزلیہ روایت کے سحر سے کبھی آزاد نہ ہوسکے۔ ان کی تمام تر کامیاب نظمیں غزلیہ رنگ وآہنگ سے مملو ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا حسن بھی ہے اور قبح بھی، خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ ان کے تمام نقادوں کی کم وبیش یہی رائے ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جوش کا تخلیقی باطن غزل سے ہم آہنگ تھا۔ ان کی ذہنی تربیت کلاسیکی روایت کے زیرِ اثر ہوتی تھی۔ عزیز لکھنوی سے انھیں تلمذ تھا۔ تقریباً چھ سال تک یہ رشتہ برقرار رہا۔ عزیز غزل کے مستند اساتذہ میں تھے، ان کے مشہور شاگردوں میں اثر لکھنوی، جگت لال رواں اور جوش ملیح آبادی ہیں۔ عزیز کی تربیت نے بھی جوش کو کلاسیکی رموز ونکات سے آشنا کیا۔ جوش اس کے معترف ہیں، وہ کہتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ حضرت عزیز بہت ہی اچھے استاد اور بہت ہی ذی علم بزرگ تھے۔ جہاں تک زبان کی صحت اور لہجے کی نجابت کا تعلق ہے ان کی ذات سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا۔'' (یادوں کی برات، ص ۱۲۹)

جوش کی غزلیہ شاعری میں پیکر تراشی کا عمل بھی بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعرانہ فکر بھی اپنی بعض خصوصیات کے ساتھ دانش ودانائی کا ایک الگ گوشہ ہے۔ جذبہ اور

احساس کے بغیر تو شاعری اپنے مفہوم سے ہی محروم ہو جاتی ہے لیکن جو روشنی اسے نئی جہتوں کی طرف لے جاتی ہے وہ عقل، علم اور تجربے سے آتی ہے جو سوچنے کے عمل کو زیادہ بامعنی بنا دیتا ہے۔ جوش کی پیکر تراشی کو اس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھنا ضروری ہے۔ یہ شعر بطور خاص اس بات کی نشاندہی کرتا ہے:

آچکا ہے رونقِ فردا کا جنبش میں جلوس
آدمی کا خانۂ امروز، ویراں ہے تو کیا

کہیں کہیں جوش نے پیکر تراشی اور نقش گری میں تاریخی معلومات اور صدیوں سے چلی آتی ہوئی روایتوں کا بھی سہارا لیا ہے اور بڑے خوبصورت انداز میں لیا ہے:

آرہی ہے آگ لنکا کی طرف بڑھتی ہوئی
آج راون کا محل سیتا کا زنداں ہے تو کیا

جوش کی ایک مختصری فی البدیہہ غزل ہے اس میں پیکر تراشی کے ایک دو بہت ہی حسین نمونے موجود ہیں، ملاحظہ ہوں:

تم مری سمت نہ دیکھو کہ میرے چہرے پر
آرزو کی ہے شکن، لہر ہے ارمانوں کی
مسکراتے ہوئے یوں آئے وہ میخانے میں
رُک گئی سانس چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

ایک اور مختصر نظم کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں! یہاں بھی پیکر تراشی کا عمل متحرک ہے اور متحرک تصویروں کا سا انداز رکھتا ہے:

جھومتی جب کبھی اٹھتی ہے گھٹا قبلے سے
اپنی بیتی ہوئی راتوں کا خیال آتا ہے
دل سے اٹھتا ہے دھواں دہر پہ چھا جاتا ہے
ہائے وہ وقت جب اپنے پہ ترس آتا ہے

جوش نے اپنے محسوسات اور تصورات کے مختلف رنگوں سے جس خوبصورت اور زندگی سے بھر پور شعری کائنات کی تخلیق کی ہے اس کا مرکزی کردار انسان ہے۔ اسی کردار کے گرد اُن کی پوری کائنات رقص کرتی ہے۔ جوش کی شعری تخلیقات میں ابتدائی دور سے ہی انسان دوستی کی ایک زیریں لہر کا احساس ہوتا ہے جو ہمیں انسانی دردمندی، دل سوزی، جذبۂ معصومیت اور قلبی تاثر کی شکل میں ملتی ہے۔ ''ٹھنڈی اُنگلیاں'' اور ''دردانگیز کھلونا'' جیسی مختصر نظمیں اس کی مثال ہیں لیکن اس وقت میں اُن کی ایک نظم ''وطن'' کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ''وطن'' اُن کی ایک پرانی نظم ہے جس میں وطن کا تصورِ وطنیت نہایت واضح طور پر جلوہ گر ہے۔ اِس پر خود جوش نے ایک حاشیہ لکھ کر اپنے نظریۂ وطنیت کو واضح کیا ہے، حاشیہ کے الفاظ یوں ہیں:

''میں تمام نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں۔ وطن کے اُس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور ابنِ آدم کی تقسیم چاہتا ہے، انتہائی حقارت سے دیکھتا ہوں لیکن اِس قدر وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی درندگی سے محفوظ رکھا جائے۔''

افلاس، استحصال اور جہل کے خلاف جتنی طاقتور اور پُر اثر آواز جوش کی نظموں میں محسوس ہوتی ہے شاید اردو شاعری میں کہیں اور محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اِس سے صرف جوش کے جذبات کی گرمی اور تڑپ کا ہی پتہ نہیں چلتا بلکہ اُن کی ذہنی توانائی اور آگہی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے جیسے یہ دائرۂ فکر پھیلتا جاتا ہے اُن کی نظمیں ایک نئی کائنات تعمیر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ درسِ آدمیت، زوالِ جہاں بانی، نظامِ نَو اور ''نیا میلاد'' جیسی نظمیں ایک عالم گیر اور غیر طبقاتی انسانی سماج کی تصویر پیش کرتی ہیں جیسے:

نظر ہے کلبۂ مزدور پر معمارِ فطرت کی
تلاطم میں ہے قصرِ آہنی سرمایہ داری کی

شاہانِ کج کلاہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی

درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شانِ دارائی

یا پھر:

ایک انوکھی ضو سے دنیا جگمگا دی جائے گی
شمعِ برتر آدمیت کی جلا دی جائے گی

اِس نوع کی نظموں میں ان کا نظریۂ انسان دوستی اپنے نکھرے ہوئے روپ میں نظر آتا ہے۔ عالمی اخوت، علم اور روشن خیالی، جبر و استحصال سے نجات اور مسرتوں سے معمور سماج کا خواب جیسے موضوعات ان میں سانس لے رہے ہیں۔ یہی عالم گیر اعلیٰ انسانی قدریں اُن کے تصورِ حیات کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ انھوں نے خارجی اور فطری مناظر کی تصویر کشی اور پیش کش کے وسیلے سے بھی کبھی کبھی انسان کی سربلندی اور عظمت کے گیت گائے ہیں۔ ''بدلی کا چاند'' جیسی خوبصورت نظم کا آخری شعر ملاحظہ ہو:

کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

یا ''ماتمِ آزادی'' کے دو بند دیکھئے:

سروِ سہی، نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار
بلبل، نہ باغباں، نہ بہاراں، نہ برگ و بار
جیہوں، نہ جامِ جم، نہ جوانی، نہ جوئے بار
گلشن، نہ گلبدن، نہ گلابی، نہ گل عذار
اب بوئے گل، نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

جوش کی شاعری کا تذکرہ ان کی شاہکار نظم ''حرفِ آخر'' کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہ اُن کی برس ہا برس کی فکری کاوشوں اور تخلیقی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے اور کئی اعتبار سے اردو شاعری کی تاریخ میں الگ الگ اور منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ تخلیق کارکائنات اور شعورِ انسانی کے ارتقاء کو نئے علوم کی

روشنی میں جوش صاحب نے جن حیاتی پیکروں اور حرکی تصویروں میں پیش کیا ہے وہ اچھوتی اور بے مثال ہیں۔ یہ اردو زبان کی ایک ایسی نادر اور بے مثل نظم ہے جس کے تنقیدی تجزیے کے لئے ایک علاحدہ تفصیل درکار ہے۔ اِس وقت تفصیل میں جانے کا موقع نہیں اِس لئے بس اِتنا عرض کیا جاسکتا ہے کہ ''حرفِ آخر'' انسانی شعور کی طاقت، عظمت اور وسعت کا ایک غیر فانی نغمہ ہے۔ مجموعی اعتبار سے جوش کی شاعری ایک جلوۂ صد رنگ ہے جس کا سب سے گہرا اور بنیادی رنگ انسان دوستی کا رنگ ہے۔

آخر جوش نے مرثیے کیوں کہے؟

اقبال مرزا

ثاقب لکھنوی نے اپنے دل کی بات یوں کہی:

ہر اک نگاہ میں ہے کچھ نہ کچھ تصور حق
ہم اس تصور حق کو حسین کہتے ہیں

یا پھر خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا:

شاہ است حسین، بادشاہ است حسین
دین است حسین، دیں پناہ است حسین
سرداد نہ داد دست در دست یزید
حقی کہ بنا لا اللہ است حسین

اور علامہ اقبال نے اسی بات کو کچھ یوں کہا:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آلباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

اور تلاشِ حق میں نکلے ہوئے علامہ جمیل مظہری اس طرح گویا ہوئے:

دیر میں وہ، حرم میں وہ، عرش پہ وہ، زمیں پہ وہ
جس کی پہنچ جہاں تلک، اس کے لئے وہیں پہ وہ

فطرت انسان کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو ہم میں سے ہر شخص بلکہ ہر ذی روح تلاشِ حق میں ہے

مگر چونکہ ہماری فکر الگ الگ ہے اس لئے ہمارا حق کے پانے کا پیمانہ بھی الگ الگ ہی ہونا چاہئے ۔ان سوالات کی روشنی میں آیئے ہم جوش کی تحلیل نفسی کرتے ہیں آخر جوش جیسا شخص جو مولوی کے خدا کو ماننے سے انکار کرے یا دوسرے معنوں میں رسم ورواج سے بغاوت کرے۔شراب کو جائز قرار دے، مصلحت کو بزدلی سے تعبیر کرے، دلیل کو اول مذہب گردانے اور لاشعوری اور شعوری طور پر حق کی جستجو بھی کرے، پھر جوش کی فطرت پر بھی نظر رکھئے ۔ جوش جس ماحول میں پروان چڑھے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ جوش کی طبیعت میں ضد، بہادری، حق کے لئے لڑ جانا، انسان سے محبت بلکہ ضرورت مند کے لئے حد سے گزر جانے کی حد تک چلے جانا، ایسی صورت میں جوش کو ایک ایسے باکمال شخص کی تلاش تھی جو جوش سے بھی چار قدم آگے نکلا ہوا ہوتا کہ جوش اس کو اپنا رہبر بنا سکیں اور اسی سے اپنی زندگی کو وابستہ کرسکیں یقیناً جوش کو یہ سب امام حسین کی ذات گرامی میں نظر آیا ہوگا اسی لئے جو جوش وخروش جوش کے مرثیوں میں ملتا ہے جس سے ہر قاری کو نظر آتا ہے کہ جوش کی دلی کیفیت ہر شعر سے ظاہر ہوتی ہے۔ جوش کی نظر تاریخ پر بھی تھی۔ جوش کا مطالعہ بہت گہرا اور سمجھنے والا تھا اسی لئے جوش نے جب یہ کہا تو بجا کہا:

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم
دشتِ ثبات و عزم ہے دشت بلا و غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم
اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے
جس سورما کا اسم گرامی حسین ہے

جوش کے ذہن کو اگر سمجھنا ہے تو پہلے ان کی تحریروں سے کما حقہ واقف ہوں پھر کہیں جوش کو سمجھ سکتے ہیں۔ جوش ایک بیدار مغز انسان تھے جو ہر چیز کو سمجھ کر مانتے تھے پھر بھی جو انھوں نے فرمایا آپ بھی سن لیں:

"یورپ کی بے دینی اور ہند و پاک کی دینداری میں فرق یہ ہے کہ وہ تفکر و

تدبر پر قائم ہے اور یہ تقلید و تعصب پر۔ اس میں تحقیق کا عنصر غائب ہے
اور اس میں روایات و اوہام کا۔ اور اس اندھیر نگری میں یہ کہنے کی جرأت
کون کر سکتا ہے کہ تحقیقی کفر بہتر ہے تقلیدی ایمان سے اور امن پرور بے
دینی بہتر ہے فساد انگیز دینداری سے۔''

آج جس گھنگھور اندھیرے میں انسانیت گھری ہوئی ہے جہاں مذہب کے نام پر قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ جہاں عورتوں اور بچوں کے حقوق پائمال کئے جا رہے ہیں یہ سب اندھی تقلید اور تعصب کی دین ہے۔ جوش نے زندگی بھر وحدتِ انسانی کا درس دیا۔ آپ نے مرثیوں سے وہ کام لیا جو رہتی دنیا تک زندہ و پائندہ رہے گا۔ جوش کے اس مرثیے کے یہ دو بند ملاحظہ فرمائیں:

اب بھائی ہے کہ بھائی کو پہچانتا نہیں
ہم بھائی بھائی ہیں یہ کوئی جانتا نہیں
اک دوسرے کو دوست بھی گردانتا نہیں
سب ایک کوکھ سے ہیں کوئی مانتا نہیں
اربابِ آشتی ہمہ تن جنگ ہوگئے
ہم جس قدر وسیع ہوئے تنگ ہو گئے

عالم تمام پرتوِ حسنِ خیال ہے
جو مرد ہے وہ عالم گیتی کا لال ہے
کل دہر ایک مورثِ اعلیٰ کی آل ہے
تقسیمِ خونِ حضرتِ انساں محال ہے
انساں بہم ہوں غیر یہ کیسا جنون ہے
جس رگ میں بھی رواں ہے وہ تیرا ہی خون ہے

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں جوش تلاشِ حق میں گھومتے پھرتے ایسی جگہ پہنچے جہاں جوش کو اپنی فطرت کی سادگی، بہادری، جلالت، عزم اور جو بھی وہ متمنی تھے سب کچھ ایک جگہ مل گیا جو جوش

نے تحریر کیا ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین
جس نے اپنے خون سے دنیا کو دھویا وہ حسین
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین
جس نے سب کچھ کھو کے پھر بھی کچھ نہ کھویا وہ حسین
مرتبہ اسلام کا جس نے دوبالا کر دیا
خون نے جس کے دو عالم میں اجالا کر دیا

جوش کو ایک ایسی ہستی کی تلاش تھی جس کے نقشِ قدم پر چل کر جوش کی فطرت کو سکون ملے اور وہ تمام صفات جن کی جوش کو تلاش تھی وہ سب جوش کو امام حسین کی ذات میں نظر آئے اسی لئے جوش کے مرثیوں میں جو جوش نے کہے تو امام حسین کے لئے مگر ان میں پیغام جوش کا بھی شامل ہے۔ جوش ایک صوفی صفت، حق پرست، بہادر جوشیلے اور سماج سے نہ ڈرنے والے شخص کا نام ہے۔ جوش نے امام حسین کی زبان سے جو الفاظ کہلوائے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

دنیا جسے کہتے ہیں کثافت کا ہے انبار
خنزیر کی ہڈی سے بھی کچھ بڑھ کے ہے مردار
ناپاک ہے، بد اصل ہے، کم ظرف ہے بدکار
مردار شکم اس کا تو پشت اس کی ہے بیمار
مبروص کے داغوں سے عفونت میں سوا ہے
ذلت کا یہ لقمہ ہے، سگوں کی یہ غذا ہے

مندرجہ بالا بند کا ہر لفظ جوش کے شعور اور لاشعور کی بولتی، جیتی جاگتی تصویر پیش کر رہا ہے۔ یہ ولولہ، یہ ذہنی فکر جوش کو کہاں سے حاصل ہوئی اسی کو حق کی تلاش کا اگر نام دیا جائے تو افضل ہوگا جوش ایک بیدار مغز، مفکر، نڈر اور تلاشِ حق میں مگن، تھے۔ ان کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو جوش کے ذہن کو سکون عطا کر سکے اور جوش کو وہ سب امام حسین کی شخصیت میں ملا جسے وہ جوش تلاش کرنے نکلے تھے

اسی لئے جوش کے مرثیوں میں ان کے اپنے جذبات کوٹ کوٹ کر ملتے ہیں۔آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

جو لوگ کہ ڈر جاتے ہیں بادل کی صدا سے
کانپ اٹھتے ہیں بچوں کی طرح ذکرِ دغا سے
جب ہوتی ہے مذہب کی کشش فضل خدا سے
لڑ جاتے ہیں، دبتے نہیں اربابِ جفا سے
ہرگز نہ ڈرو کفر سے ایماں کا سبق ہے
ان کی یہ شجاعت نہیں یہ قوتِ حق ہے

یا جوش کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں جس میں فلسفہ بھی ہے اور صداقت بھی:

عالم میں ہو چکا ہے مسلسل یہ تجربہ
قوت ہی زندگی کی رہی ہے گرہ کشا
سر ضعف کا ہمیشہ رہا ہے جھکا ہوا
ناطاقتی کی موت ہے طاقت کا سامنا
طاقت سی شے مگر خجل و بدنصیب تھی
ناطاقتی حسین کی کتنی عجیب تھی

جوش نے اوائل عمری سے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ انتہائی صبر طلب تھا جوش کی شادی اور شادی میں ہنگامے، خاندان کے بزرگوں سے مخالفت، ہندوستان بٹوارہ، اولادوں کی طرف سے عدم تحفظ، اِن تمام حالات کا وقتی حل تو ممکن نہ تھا مگر ذہن کو سکون کی تلاش بھی تھی چنانچہ جوش نے شاید انہی مسائل کو اس طرح قلم بند کیا ہے۔آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ہر چند کہ ایوب بھی اِس فن میں تھے یکتا
یونس نے بھی اک حد تک اسے خوب نبھایا
یعقوب نے بھی زور تحمل کا دکھایا

پر سب سے رہا بڑھ کے محمد کا نواسہ
حیرت میں پیمبر ہوئے وہ کرکے دکھایا
مرتے نہیں کس طرح، ایسے مر کے دکھایا

جوش مرثیہ لکھتے تھے اور مرثیے سے اپنے دل کو تسلی دیتے تھے۔ اچھے اور برے حالات کس پر نہیں آتے جوش بھی گوناں گوں مصائب دنیا سے ہمکنار ہوئے مگر جوش نے جس کو اپنا ہیرو مانا تھا جب بھی جوش مشکلات کا شکار ہوتے مدد اسی کی بارگاہ سے چاہتے تھے۔ جوش پر جب مالی مشکلات کا بوجھ پڑا تو جوش نے دنیا اور مالِ دنیا کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اسی دوران جوش کے ذہن نے ان کو یہ پیغام دیا، ملاحظہ فرمائیں اِس بند میں دنیا جس دولت کے پیچھے جان دینے کو تیار ہے جوش نے اس کی حقیقت کو کس طرح سے سمجھایا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو:

ثروت جو زیادہ ہو تو ایماں نہیں رہتا
انسان یہ وہ شے ہے کہ انساں نہیں رہتا
آسودگی روح کا ساماں نہیں رہتا
دل انجمنِ حسن کے شایاں نہیں رہتا
دولت کو بہت لوگ یہ کہتے ہیں خدا ہے
میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زر ایک وبا ہے

فطرتِ انسانی کبھی نہیں بدلتی مگر علم اور تحقیق سے فکر انسانی بدلتی رہتی ہے۔ یقیناً جوش نے بھی جب تاریخ انسانی کا مطالعہ کیا تو وہ بھی بہت سے افراد سے جیسے "رام" "کرشن" "گرونانک" "حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ سے کسی نہ کسی صورت متاثر ضرور ہوئے ہوں گے مگر ان میں تین ہستیاں یعنی حضرت محمد مصطفیٰ، حضرت علی المرتضیٰ اور حسین شہید کربلا جوش کے دل و دماغ میں سما گئے۔ جوش کو اِن حضرات میں وہ سب کچھ ملا جو جوش کے ذہن میں ایک کامل انسان میں ہونا چاہئے اور دوسری طرف اِن تینوں ہستیوں میں بھی وہی چیز کارفرما ملی یعنی اپنے سے افضل چیز کی تلاش، یہ کامل ہستیاں بھی بار بار اپنے سے افضل قادر مطلق کی طرف اشارے کرکے یہ بتانے کی کوشش میں لگے

ہوئے تھے کہ انسان ابھی تک اس جگہ نہیں پہنچا جہاں اس کی منزل ہے چنانچہ جوش بھی یقین اور گمان کے دائرے کو پار کرنے سے قاصر رہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آپ بھی اگر اپنے آپ سے یہی سوال کریں کہ کیا آپ یقین کی منزل پا گئے تو جواب نہیں میں ہی ملے گا حضرات وقت کی قلت کے سبب میں جوش کا یہ بند پیش کرتا ہوں:

تکلیف کو تفریح بنالینے کی صنعت
حاصل ہے انھیں جو ہیں پرستارِ حقیقت
آئینہ ہے اسرار کا ہر منظرِ قدرت
وہ چاند کی خنکی ہو کہ سورج کی حرارت
مہمل ہیں یہ لفظیں، یہ برا ہے وہ بھلا ہے
جو کچھ ہے وہ بس ایک تبسم کی ضیا ہے

الغرض ہم واقعی جوش کی فطرت سمجھنے سے قاصر رہے اور یہی وجہ ہوئی کہ کسی نے جوش کو ملحد گردانا تو کسی نے زندیق کا لفظ تراشا مگر جوش ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنے خیالات میں غرق، اپنی فکر سے دنیا کو دیکھتے رہے اور ممکن ہے وہ ہماری نادانیوں پر مسکراتے ہوں کہ مجھ پر کیچڑ اچھالنے سے پیشتر یہ تو سوچو کہ کیا تم دنیا کے اسرار و رموز سے واقف ہو گئے؟ میں اپنی بات جوش کے اس شعر پر ختم کرنا چاہوں گا ممکن ہے آپ بھی اس سے اتفاق کریں، میری نظر میں جوش کا مرثیوں کے سلسلے میں یہ آخری پیغام ہی ہوگا:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

☆☆☆

جوش کا تصورِ زن
''حسن اور مزدوری کے خصوصی حوالے سے''

شبنم حمید

اردو ادب کے عظیم انقلابی اور رومانی شاعر جوش ملیح آبادی کا جنم ایک جاگیردار گھرانے میں ہوا۔ اُس وقت گھر کے پورے ماحول پر جاگیردارانہ نظام حاوی تھا لہٰذا اُن میں خود پسندی، انانیت اور سماجیت جیسی خصوصیات کا ہونا فطری تھا۔ شاعری انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ بچپن انتہائی عیش و عشرت میں گزرتا رہا۔ زندگی کے حقیقی میدان میں قدم رکھتے ہی اُن کی ساری آسائش اور سہولیتیں اُن سے رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئیں اور ساتھ ہی پریشانیوں اور دشواریوں نے انھیں جکڑنا شروع کر دیا۔ ایک طرف اُن کے اپنے ہی والد سے اختلافات بڑھنے شروع ہوئے تو دوسری طرف عزیزوں، دوستوں سے بھی رشتہ استوار نہ رہا۔ یہ جوش کے لئے انتہائی کرب ناک حالات تھے۔ اب اِس پس منظر میں جوش کی شاعری کو دیکھنے پر احساس ہوتا ہے کہ اِنھیں رنج و غم کے نتیجہ میں اُن کی شاعری پروان چڑھتی ہے اور وہ انتہائی جذباتی ہو کر اپنی زندگی کی دشواریوں، پریشانیوں کو شاعری کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اردو شاعری میں جوش ایسے شاعر ہیں جو کبھی جذباتی ہو کر شاعری میں گھن گرج پیدا کرتے ہیں تو کبھی ارمان کا سہارا لے کر دل کے ارمانوں کو پھولوں کی مانند نزاکت سے بیان کرتے ہیں اور کبھی انقلاب کا دامن تھام کر پورے ملک اور سماج میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں۔ اُن کی شخصیت رنگا رنگ ہے۔ حسن پرست ہونے کے سبب ایسی رومانی اور عشقیہ نظمیں لکھتے ہیں جو

اردو ادب میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ جب اُن کی باغیانہ فطرت جاگتی ہے تو بغاوت سے لبریز ایسی نظمیں لکھتے ہیں کہ پورا معاشرہ بغاوت کے شعلے سے دہک اُٹھتا ہے۔

شاعر اپنے جذبات اور خیالات کو لفظوں میں ڈھال کر شاعری کے قلب میں اُتارتا ہے شاید ایک نقاد بھی ان کے حساس دل اور خیالات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ نقاد تو محض الفاظ کے الٹ پھیر اور صوتی قوائد کی بنیاد پر تنقید کرتا ہے اس کو اِس سے مطلب نہیں کہ شاعر نے کن حالات اور جذبات کے تحت شعر لکھا ہے۔

جوش کی زندگی میں جب عزیز و اقارب سے رشتوں کا نباہ نہ ہو سکا اور اعتماد کی ڈور ٹوٹتی چلی گئی اور رنج و غم حد سے آگے بڑھ گئے تو مناظرِ فطرت کی حسین وادی میں پناہ تلاش کی جس کی مثال ''ترانۂ بیگانگی'' سے دی جا سکتی ہے۔ اِس نظم میں سماجی رشتوں سے متعلق بے اعتمادی کا رجحان پایا جاتا ہے اور وہ فطرت کے آغوش میں پناہ لینے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں:

لہریں ہنس ہنس کے عجیب نغمے سناتی ہیں مجھے
ڈالیاں پھولوں کی جھک جھک کر بلاتی ہیں مجھے

جوش کی فطرت پسندی انھیں اپنوں سے دوری کے سبب حاصل ہوئی۔ جوش کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ جوش اپنے فطری حسن اور عشق کے محور سے باہر نہیں نکلتے۔ اُن کی رومانی شاعری، ان کی فطرت کی آواز پُر کیف ہے۔ جس میں ایک طرح کی سرشاری، سرمستی اور رومانیت پائی جاتی ہے۔ جوش انتہائی موثر اور دلکش انداز میں دل کا حال سناتے چلے جاتے ہیں۔ جوش کو اردو کا Wordsworth کہا جاتا ہے حالانکہ جوش Wordsworth کی طرح فطرت کی گہرائیوں اور وسعتوں میں نہ اُتر سکے اور نہ ہی اس کی تہوں در تہوں میں کوئی فعال قوت ہی ڈھونڈ سکے۔ باوجود اِس کے جوش کی شاعری کئی جہتوں پر محیط ہے، مناظرِ فطرت، خمریات، شبابیات، انقلابی تفکرات اور رومانویت جیسے موضوع پر ان کی شاعری پھیلی ہوئی ہے۔ تشبیہات اور استعارات اور اس کی دوسری صنعتوں کا بھی جوش نے اپنی شاعری میں موزوں اور مناسب استعمال کیا ہے۔ زبان میں سادگی اور شگفتگی نے اشعار میں دلکشی اور

جاذبیت پیدا کردی ہے۔ الفاظ کا خوش سلیقہ اور مناسب استعمال واضح اشارہ کرتا ہے کہ جوش کو لفظوں کی کیاری سے پھولوں کو چن کر ایک خوبصورت نظموں کا گلدستہ ترتیب دینے کا ہنر آتا ہے۔ جوش اپنے انقلابی ذہن اور جذباتی بیان سے لوگوں کے دلوں میں ہلچل مچا دیتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر شئے میں ایک طرح کی فطری ہنگامہ آرائی پیدا ہوگئی ہے۔ جوش نے اپنی عشقیہ اور رومانی شاعری کا تانا بانا بڑے ہی خوبصورت اور دلکش تشبیہوں سے تیار کیا ہے لیکن اِس میں لطف اندوزی اور جاذبیت بلند درجہ کی ہے۔ اپنی ایک نظم ''حسن اور مزدوری'' میں انھوں نے ایک ''حسن'' کی مزدوری کو کچھ اِس انداز میں بیان کیا ہے:

حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے
\ جس میں ہونا چاہئے پھولوں کا اِک ہلکا سا ہار
اِس جبیں پر، اور پسینہ ہو چھلکنے کے لئے
جو جبینِ ناز ہو افشٖ   کنے کے لئے
مفلسی چھانٹے اتـ   ـب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے
نازنینوں کا یہ عالم، مادرِ ہند آہ آہ
کس کے جورِ ناروا نے کردیا تجھ کو تباہ

اِس نظم میں انھوں نے ایک دوشیزہ جو سڑک پر دھوپ کی تمازت برداشت کرتے ہوئے پتھر توڑنے کو مجبور ہے کا ذکر حقیقی انداز میں کیا ہے۔ جوش یعنی ایک حساس سماجی رہنما کو اس خوبصورت عورت کی چوڑیوں کی کھنک سنائی دیتی ہے۔ چوڑیوں کے دلفریب نغمے سے شاعر کو ایک آواز، ایک شکایت، ایک درد، ایک شور اور ایک تڑپ کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر خود استفہامیہ انداز میں کہتا ہے کہ یہ کیسا سماج ہے، جہاں صنفِ نازک پتھر توڑنے کو مجبور ہے؟ جوش کو سماج کے اِس تلخ پہلو نے اتنا بے چین کر دیا کہ اُن کے دل کے جذبات چیخ اُٹھتے ہیں۔ ایک فلک شگاف آواز کے ساتھ پکار

اٹھتے ہیں کہ یہ کیسا نظام حکومت ہے کہ جہاں عورت کے ساتھ اتنی زیادتی ہو؟ یہ کتنی تکلیف دہ بات ہے کہ جہاں چوڑیوں کی کھنک گھر کی چہار دیواری میں زیب دینی چاہئے، چوڑیوں کے دلفریب ساز سے گھر کے اندر ایک ترنم پیدا ہو جانا چاہئے، افسوس اُس سماج نے ایسا نظام زندگی ترتیب دیا کہ عورت کے نازک ہاتھ پھولوں کے ہار ترتیب دینے کے مقام پر فولادی ہاتھ بن کر سنگ کو پارہ پارہ کرنے کے درپۂ ہیں اور شاعر پکار اٹھتا ہے:

چوڑیوں کے ساز میں یہ شور ہے کیسا بھرا
آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا

جوش کو مجبور عورت کی زلفیں اور اس کی دیدۂ غمناک کے نظارے ازحد متاثر کرتے ہیں۔ شاعر اپنے لاشعور سے بار بار سوال کرتا ہے کہ یہ کیسا سماجی نظام ہے؟ یہ کیسا قومی ڈھانچہ ہے؟ یہ کہاں کے ٹھیکہ دار ہیں جو دوشیزۂ ارض کو سخت پتھر توڑنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ سماج میں صنف نازک کی حالت ابتری شاعر کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ وہ سماجی نابرابری کا شکوہ کرتا ہے۔ عورتوں کی بے بسی اور مجبوری کا عوام کو احساس دلاتا ہے:

دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکلِ عنبر سرشت
ہو رہا ہے کم سنی کا لوچ جزوِ سنگ و خشت

شاعر انتہائی افسوس اور بے چینی کا اظہار کچھ اِس انداز میں کرتا ہے:

پی رہی ہیں سُرخ کرنیں مہر آتش بار میں
نرگسی آنکھوں کا رس اس چمپئی رخسار میں

معصوم عورت کی دلخراش کیفیات کا ذکر شاعر بار بار شاید اِس لئے کرنا چاہتا ہے کہ اِس طرح کے انکشافات کرنے سے یہ ظالم سماج، یہ مردوں کی دنیا کے بے حس انسان شاید ایک نیا صحت مند نظام مساوات اور ایک سلجھا ہوا معاشرہ تیار کر دیں۔ جس میں ان معصوم بے گناہوں کی حالت زار کو نیا راستہ اور ایک مضبوط ہاتھ مل جائے۔ جو اُن کی اپنی دنیا میں قوسِ قزح بکھیرنے کے لئے ایک آزاد آسمان فراہم کرے۔ جوش اپنے لفظوں سے احساس دلاتے ہیں کہ دیکھو اِن

معصوموں کے اداس چہرے اور اِن چہروں پر دکھ کی لکیریں، شاید یہ لکیریں اپنا رخ ایسے بدلیں کہ ان کی قسمت کا زائچہ ہی بدل جائے۔ شعر ملاحظہ ہو:

غم کے بادل خاطرِ نازک پہ ہیں چھائے ہوئے
عارضِ رنگیں ہیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے

چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے رنگینِ شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب

ہندوستان مجبور اور معصوم دوشیزاؤں کی پریشاں حالی پر شاعر دل کی گہرائیوں سے کھوکھلے سماج کے نقشہ میں سوالیہ نشان لگاتا ہے کہ کیوں حسن آہنی سنگ کو پارہ پارہ کرنے پر مجبور ہورہا ہے۔ دست نازک تو چھوٹے چھوٹے پھول جیسے بچوں کی پرورش کرنے، اپنے چھوٹے سے باغ کی آبیاری کرنے اور اپنے چھوٹے سے محل کی آرائش کے لئے درکار ہونے چاہئے چنانچہ شاعر بار بار سماج سے مخاطب ہو جاتا ہے، طنز کے انداز میں کہتا ہے:

حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے

یہاں پر ''اور'' لفظ سماجی نظام کے عیب کی مزید وضاحت کرتا ہے۔ غرض جوش نے مختلف انداز سے سماج کے سامنے انکشافات کئے ہیں جس سے خصوصی طور پر عورتوں کی ابتر حالت کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ شاعر سماج کے ان سبھی عناصر سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہے جو کسی کو مظلوم بنادے۔ جوش کو اسی بنیاد پر بغاوت کے شاعر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جوش ہر اُس سماجی نظام کو درہم برہم کر دینا چاہتے ہیں جو کسی مظلوم کو بے بس کردے۔ جب جوش نے ایک حسین پیکر کو ظلم و ستم برداشت کرتے دیکھا تو اُن کے دل میں پوشیدہ فطرتِ رحم جاگ اُٹھتی ہے۔ جوش کی شاعری کا یہ پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جوش کا اندازِ بیان قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کرر کھ دیتا ہے۔ جوش رومانویت میں انقلابیت کا عکس بیان کرتے ہیں:

فکر سے جھک جائے وہ گردن تُف اے لیل ونہار
جس میں ہونا چاہئے پھولوں کا اِک ہلکا سا ہار

اس نظم کے اشعار سے جوش کی شاعری کے اُس پہلو کے اشارے ملتے ہیں جو رومانویت اور فطرت کو پیش کرتی ہے۔ انھوں نے فطرت کی بہترین عکاسی کی ہے۔ جوش نے ترقی پسند تحریک کی آڑ میں اپنی شاعرانہ طبیعت کو جذب کر کے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ جوش نے اپنی اِس نظم کے ذریعہ آتش بار اشعار کا ایک گوشہ ترتیب دیا ہے اور ہندوستانی سماج کو غیرت کا احساس دلایا ہے۔ ایک مظلوم اور معصوم عورت کے مجازی حسن کو اُس انسان سے وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک عورت کو اور بھی مجبور اور بے بس بنا دیتے ہیں۔ یہ تمام حالات اُن کی شاعری میں ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ کبھی وہ جذبہ و جوش سے سرشار نظر آتے ہیں تو کبھی رومانویت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں اور انتہائی خوبصورت الفاظ میں رومان پرور ماحول پیش کرتے ہیں۔ سڑک پر پتھر توڑتی ہوئی عورت کی ایک ایک حرکات وسکنات میں حسن تلاش کر لیتے ہیں کیوں کہ اس مظلوم کے حسن میں ایثار وقربانی کا جذبہ ہے۔ انتہائی تکلیف کے عالم میں کہتے ہیں:

بھیک میں وہ ہاتھ اُٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا تھا حنا کے واسطے

اور پھر بے ساختہ سماج کے اس کھوکھلے نظام سے سوال کرتے ہیں:

کیوں فلک، مجبور ہوں آنسو بہانے کے لئے
انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لئے

اور آخر میں ایک ترقی پسند سماجی رہنما کے مانند، ایک سماجی شاعر کی حیثیت سے ایک حتمی اعلان کرتے ہیں:

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہئے
اِس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہئے

☆☆☆

شخصی مرثیہ گوئی اور جوش

لئیق رضوی

اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت بہت قدیم ہے۔لیکن بد قسمتی سے ہمارے محققین اور ناقدین نے اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کہ اور ہم اس ادبی ورثے سے کٹتے چلے گئے۔ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ اس کا بڑا سرمایہ یا تو ضائع ہوگیا یا وقت کے دھندھلکوں میں کھو گیا۔اردو میں جو، شخصی مرثیہ میں تلاش کر سکا ہوں، ان میں سب سے قدیم شاہ برہان الدین جانم کا ہے۔شاہ برہان الدین جانم نے یہ مرثیہ اپنے والد شاہ میران جی کی وفات (۹۷۰ھ) پر کہا تھا۔اس کے بعد جعفر زٹلی، عبد الحی تاباں، نساخ، غالب، مومن، ناسخ، میر انیس، حالی، اکبر، اقبال، محمد علی جوہر، چکبست اور سرور جہان آبادی، سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ پروان چڑھتا گیا اور آج بھی بدستور زندہ و جاری ہے۔(اس بارے میں میں اپنے مقالے 'اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت' میں تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں)

اردو میں، مرثیہ عربی، فارسی سے آیا، لیکن یہاں کربلائی مرثیوں کو کچھ ایسا عروج ملا کہ یہ صنف ان سے ہی پہچانی جانے لگی۔اردو میں مرثیہ، کا مطلب کربلائی مرثیہ ہے۔باقی مرثیہ شخصی مرثیہ کہلائے۔شخصی مرثیہ کی نہ کوئی خاص ہیت مخصوص ہے، اور نہ ہی اجزائے ترکیبی ہی طئے ہیں، لیکن ایک مکمل اور سلسلے وار شکل بنانے کے لئے، شخصی مرثیہ میں جو اجزا ضروری ہیں، ان میں چہرہ، وصف اور بین بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔بعض شعرا نے اس میں دعا کا باب بھی جوڑا ہے۔رثاییت، نظم کی اس کی بنیادی شرط ہے۔محض کسی کی موت کے حوالے یا ذکر سے کوئی نظم شخصی

مرثیہ نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ اس باب میں، ان تعزیتی رباعی اور قطعات تاریخ وفات کو بھی رکھا جا ہے، جن میں رثائی لئے ہے۔

۲۰ ویں صدی میں، جن شعرا نے شخصی مرثیہ کو اعتبار بخشا، ان میں جوش ملیح آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ شخصی مرثیہ گوئی، بھی جوش کا فن خاندانی ہے۔ پردادا فقیر محمد خاں گویا سے لیکر والد بشیر احمد بشیر تک، جوش کے اسلاف کے یہاں شخصی مرثیہ نگاری کا قیمتی سلسلہ ملتا ہے۔ فقیر محمد خاں گویا نے اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر کے نائب السلطنت، معتمد الدولہ نواب آغا میر کی موت پر، پر درد مرثیہ کہا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہائے دنیا سے اٹھ گیا وہ امیر
جس کا عالم میں تھا نہ کوئی نظیر
اس بن آنکھوں میں ہے جہاں تاریک
تھا وہ گویا کہ مہر عالم گیر
ملک عزت کا آسمان تھا وہ
چرخ ہمت کا تھا وہ ماہ منیر
دفعتاً یوں اٹھالیا اسے ہائے
کیا کیا تو نے او فلک بے پیر

(ڈاکٹر ناہید عارف، گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات (لکھنو ۱۹۸۹)

جوش کے کلام میں، مجھے گیارہ شخصی مرثیہ نظر آئے۔ ان میں سے دو، ان کے والد بشیر احمد بشیر، او رباقی ایک ایک بڑی بہن، دوست روپ سنگھ، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال نہرو، عبد الحلیم شرر، علامہ راشد الخیری، حکیم صاحب عالم اور کسی نامعلوم شہید وطن کی یاد میں ہیں۔ حکیم صاحب عالم کا مرثیہ، کوئی علاحدہ نظم نہیں ہیں، یہ اشعار جوش کی ایک طویل نظم (اپنا مرثیہ) کا ہی حصہ ہیں۔ جوش نے، جگت موہن لال رواں کی موت پر بھی ایک مرثیہ کہا تھا، لیکن تلاش کے باوجود وہ مجھے حاصل نہ ہوسکا۔ جوش کے مرثیوں کو، موٹے طور پر تین حصوں میں باٹا جا

سکتا ہے۔ پہلا، عزیزوں کے مرثیے، دوسرے دوستوں کے مرثیے اور تیسرے، قومی لیڈران کے مرثیے، جن سے جوش متاثر تھے۔

جوش نے شخصی مرثیہ گوئی کو لفظ کا شکوہ اور خطیبانہ لہجہ بخشا ہے۔ جذبات اور منظر نگاری کے نئے دریچے کھولے ہیں۔ ان کے شعری پیکر زندہ اور متحرک ہیں۔ انھوں نے لفظوں کو خیال کی ڈور میں یوں گوندھ دیا ہے کہ ان میں خوبصورت ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ بالکل فٹ۔ نہ اسے ہٹایا جا سکے نہ ہی بدلا جا سکے۔ ایک دوسرے کو جوڑتے اور بڑھاتے لفظوں کا ایسا تار، جو خیال کے فطری بہاؤ کو نہ روکے نہ دھیما یا تیز کرے۔ انھوں نے لفظوں کو یوں سلیقے سے چن دیا ہے کہ ان میں خیال کا چہرہ نظر آتا ہے۔ لفظوں کی یہ چلتی پھرتی تصویریں دل کھینچتی ہیں۔

جذباتیت، جوش کے شخصی مرثیوں کا غالب رنگ ہے۔ یہ اشعار یادوں، جذبات اور تخیل کا خوب صورت میل ہیں۔ یادوں کی کوکھ سے نکلے جذبات، ان اشعار میں بے پناہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ رشتے داروں اور دوستوں کے مرثیوں میں جذبات کی یہ لے اور تیز ہے۔ جوش کے کچھ مرثیہ، مثلاً بہن اور والد کے مرثیے، انتہائی ذاتی غم کا نتیجہ ہیں، لیکن زور بیان اور جذبے کی شدت، نے اس ذاتی غم میں بھی اجتماعی احساس پیدا کر دیا ہے۔ ان میں بلا کی کیفیت اور اثر آفرینی ہے۔ انھیں پڑھیے، آپ کو لگے گا، یادوں کی ایک برات ہے جو بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ تخاطب کا انداز، لہجے کی شدت اور رنج و غم کے فطری اثر نے ان کے مرثیوں میں ۔ .پناہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اپنے والد کے مرثیے میں جوش نے جو چہرہ کہا، وہ شخصی مرثیہ میں چہرے کی خوبصورت مثال ہے۔ مطلع ہی درد کی ایک مخصوص فضا مرتب کر دیتا ہے۔

شیشوں میں زہر بھر دو پیر مغاں سدھارا
ےء خانے بند کر دو یا ایہا السکارا

--

حاضر ہے جوش صبح سے مصروف سوز و ساز
قبر پدر کی دید ہے فرزند کی نماز

لیجے سلام میں ہوں وہی کشتہء نیاز
بچپن میں آپ جس کے اٹھاتے رہیں ہیں ناز
اب وہ نگاہ لطف نہیں وہ کرم نہیں
ثابت ہوا کہ آپ کے اب کوئی ہم نہیں

جوش کی بڑی بہن افسر جہاں کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ جوش کے لئے یہ بڑا صدمہ تھا۔ ایک مرتبہ، ایک برتن جس پر مرحوم بہن کا نام کندہ تھا، دیکھکر جوش کے جذبات بے قابو ہوگئے اور ایک دردانگیز مرثیہ سامنے آیا۔

کندہ ہے اس ظرف بشکتہ پہ یارب یہ کس کا نام
آہ اب اس نام کا مفہوم ہے زیر مزار
دل پھڑک جاتا ہے میرا آہ اے ظرف ملول
آکے رکھ لوں دل میں اے میری بہن کی یادگار
وہ بہن شاداب تھے جس سے روایات قدیم
وہ بہن تابندہ تھا جس سے اب و جد کا وقار
اس کے حرفوں پر نظر پڑتے ہی اک مدت کے بعد
پھر گئی آنکھوں کے نیچے عہد طفلی کی بہار

وصف نگاری ، جوش کے شخصی مرثیوں کا خوبصورت پہلو ہے۔ اس سلسلے کے اشعار میں نظموں کا تسلسل اور قصیدہ کا شکوہ نظر آتا ہے۔ ہیرو کی شخصیت کے ہر پہلو اور ہر رنگ کو وہ تمام تر خوبیوں کے ساتھ یوں ابھارتے ہوئے چلتے ہیں کہ قاری کو اس کی عظمتوں اور اس کی موت سے ہونے والے اجتماعی نقصان کا احساس ہو جائے۔ خطابت جیسا انداز یوں تو جوش کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے مگر شخصی مرثیوں میں وصف نگاری کے باب میں یہ رنگ اور چیخ نظر آتا ہے۔ بات کو ہر ذہن تک پہچانے کے لئے جوش اپنے نکتے کو الگ الگ ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں۔ یہ تکرار، یاد ہراؤ نہیں، بلکہ یہ خیال کو اس کی تمام تر جہتوں کے ساتھ پیش کرنے کی شعوری کوشش ہے۔ یہ کوئی

قادرالکلام شاعر ہی کر سکتا ہے۔ جوش کا یہ انداز ان کے کلام میں اثر آفرینی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کا قلم ہیرو کا ایک ایسا جادوئی خاکہ کھینچ دیتا ہے کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے رہ ہی نہیں سکتا۔ گاندھی جی کے مرثیہ کے یہ بند دیکھے۔

السلام اے سینۂ اقوام کے درد نہاں
السلام اے مرہم زخم دل ہندوستاں
السلام اے دوست گیر و چارہ ساز بیکساں
السلام اے آہ سرد و تیرہ بختانِ جہاں
السلام اے اشک گرم سینہ چاکاں السلام
السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

تو امین رحمت آئینہ و ایثار تھا
صحت افکار انساں کے لئے بیمار تھا
برہمن کا چارہ فرما شیخ کا غم خوار تھا
تو رواداری کا دیوتا امن کا اوتار تھا
السلام اے کعبہ و کاشی کے درباں السلام
السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

مولانا محمد علی جوہر کے مرثیہ میں بھی، جوش نے وصف نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہ مرثیہ لفظوں کی خوبصورت تصویر ہے۔ ایک ایسی تصویر، جس میں رنگ بھی ہے اور وسعت بھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے متاع بردہ ہندوستان و ایشیا
اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار
اے غرور ملک و ملت تو وہاں لیتا تھا سانس
موت جس منزل پر بنتی ہے حیات پائیدار

تجھ کو بخشی تھی مشیت نے اک ایسی زندگی
جس بہادر زندگی پر موت کو آتا ہے پیار
تیرے آگے لرزہ بر اندام تھی روح فرنگ
اے دل ہندوستاں کے عزم تند و استوار
موڑ کر رکھ دی تھی تو نے جنگ کے میدان میں
اہل بدعت کی کلائی خنجر باطل کی دھار
طنطنے سے تیری ہیبت آفریں آواز کے
تھی حسین ابن علی کی استقامت اشکار
تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو
اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن سلطاں شعار
قوم کو بخشا ہے تیری موت نے وہ بانکپن
کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہ افتخار
یا راشد الخیری کے مرثیہ کے یہ شعر دیکھئے

یہاں بھی جوش نے وصف کے زندہ پیکر تراشے ہیں۔

وہ کہ جس کے دل کے اندر بے کسوں کا درد تھا
وہ کہ علم و فن بے ہمتاادب میں فرد تھا

وہ کہ جس کی عقل کا سینہ تھا غم سے داغ داغ
دل تو دل، دل کی طرح جس کا ڈھڑکتا تھا دماغ

جوش نے شخصی مرثیوں میں، بین کی شعوری کوشش نہیں کی ہے، لیکن جذبات کے بیچ سے بعض مقام پر درد وغم کی وہ مخصوص فضا قائم ہو جاتی ہے، جو مرثیہ کا تقاضا ہے۔ والد، بہن اور دوستوں کے مرثیوں میں، جزباتیت کی یہ لئے اور تیز ہے۔ زبان و بیان کی ندرت اور اظہار کی برجستگی اس میں مزید درد گھول دیتی ہے۔

میرے ندیم طیب و طاہر کو کیا ہوا
اے دوستو بتاؤ جواہر کو کیا ہوا

ذرے سیاہ پوش ہیں تارے ہیں سوگوار
دل کے نگر میں اب نہ کبھی آئے گی بہار
تجھ ہم نوا کی موت سے اے یار مہر کار
میں اپنی زندگی سے نہایت ہوں شرمسار

دنیائے عاشقی کی یہی رسم و راہ ہے
لیلی کے بعد قیس کا جینا گناہ ہے

گاندھی جی کی موت سے ہونے والے قومی نقصان کے ذکر سے اس بند میں بھی درد وغم کی ایک مدھم لئے سنائی دیتی ہے۔

بار احساس یتیمی سے ہر یک دل ہے اداس
رہروی کے ولولے گم، روئے منزل ہے اداس
کون یہ مقتول اعظم ہے کہ قاتل ہے اداس
صدر محفل اٹھ گیا، محفل کی محفل ہے اداس

اے ابوالہند، اے خدیو کشور جاں السلام
السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

اپنے دوست سردار روپ سنگھ کے مرثیہ میں، درد وغم کی یہی لئے اور بے پناہ کیفیت ہے۔ اس مرثیہ کے ساتھ جوش کا یہ نوٹ بھی لگا ہے کہ 'یہ نظم جذبۂ غم کی انتہائی شدت میں کہی گئی ہے، ہچکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ۔ اے قافلے والو کی ٹیپ نے اس میں نوحے کا انداز پیدا کر دیا ہے۔

گونجی ہوئی آفاق میں آواز فغاں ہے
یوں ماتم سر حلقۂ رندان جہاں ہے
ہر آنکھ سوئے مرگ بحسرت نگراں ہے

اللہ بتاؤ تو مرا روپ کہاں ہے

جس سمت ہے وہ مجھ کو بھی اسی سمت بلالو۔ اے قافلے والو

کہتے ہیں مرا روپ گیا دور بہت دور

رہتا تھا جو آنکھوں میں ہوا خاک میں مستور

بیزار ہوں جینے سے مجھے موت ہے منظور

امداد کی دو بھیک کہ ہوں بندۂ مجبور

اک بندۂ بے کار کے ارمان نکالو۔ اے قافلے والو

حکیم صاحب عالم، بھی جوش کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ یادوں کی برات میں جوش نے بڑی محبت سے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان اشعار میں بھی، دردوغم کی فضا ہے، مگر شاعر کے انتہائے غم نے شکوے کا انداز پیدا کر دیا ہے۔

مورخ تھے جو میری زندگی کے

انھیں یاروں کو چن چن کے اٹھایا

مجھے اندھا بنا دینے کی خاطر

چراغ صاحب عالم بجھایا

جو اپنی ذات سے اک انجمن تھا

فلک نے خک میں اس کو ملایا

مری خاطر جو مسجد سے نکل کر

خرابات جہاں میں چہچہایا

ستم گر زندگی تو نے بالآخر

مجھے اس کے جنازے کو دکھایا

اداسی پر مری دشمن بھی تڑپے

مشیت کو ترس لیکن نہ آیا

البتہ، عبدالحلیم شرر کے مرثیہ میں جوش نے، بین کا شعوری اہتمام کیا ہے۔ ہائے ہائے کی ردیف، اشعار میں اور درد گھول دیتی ہے۔

لکھنو کی وہ بہار غنچہ بر کف وائے غم
آگرے کی وہ نسیم گلبداماں ہائے ہائے
میرے جاں پرور رفیق غنچہ و گل آہ آہ
میرے دیرینہ انیس باد و باراں ہائے ہائے
کیوں دعا میری نہ پہنچی آہ تا باب قبول
مجھ کو تجھ سے کم نہ تھا مرنے کا ارماں ہائے ہائے

یا راشد الخیری کے مرثیہ کا یہ شعر دیکھئے، آپ کو درد تصویر نظر آئے گی۔

شمع راتوں کو بہاتی تھی جو آنسو اٹھ گئی
دہر سے وہ کیا اٹھا، دہلی سے اردو اٹھ گئی

ان اشعار میں رنج و غم کی تمام خاموش لہریں ہیں۔ جذبات کے انگنت دھارے ہیں، جو قاری کو بھی اپنے دائرے میں لے لیتے ہیں اور وہ جانے انجانے شاعر کے دکھ میں شریک ہو جاتا ہے۔ جوش کے مرثیوں میں منظر کشی کے خوبصورت مرقع بھی نظر آتے ہیں۔ جوش نے لفظوں کے انتخاب اور اپنے مخصوص برتاؤ سے ایسے شعری آئینے بنا دئے ہیں، جن میں منظر اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ نظر آتا ہے۔

جمنا کی سمت آہ ترا آخری سفر
اس درجہ تھا ہجوم کہ لرزاں تھی رہگزر
جلتے ہوئے جو دل تھے تو پھنکتے ہوئے جگر۔ پروانے کا جنازہ ہے شمعوں کے دوش پر
گلشن تھا آندھیوں کا تسلسل لئے ہوئے
گل سرنگوں تھے، میت بلبل لئے ہوئے

(مرثیہ نہرو)

موت کے باب میں، یہ شاعری جوش کی عظمتوں کی دلیل ہے۔ شخصی مرثیوں میں بھی انھوں نے بڑا دلکش شعری نظام ترتیب دیا ہے۔ خوبصورت زبان پر تشبیہ اور استعاروں کے گل بوٹے ٹانک کر انھوں نے ان اشعار میں اور حسن پیدا کر دیا ہے۔ چہیتے یار کو چاند تو بہت سے لوگوں نے کہا ہے، لیکن اس کی موت کی خبر سے بے ساختہ نکل پڑنے والے آنسوؤں کو اس نظر سے جوش ہی دیکھ سکتے تھے۔

تاریک ہے نگاہ میں دنیا ترے بغیر
بھارت ہے ایک یاس کا پتلا ترے بغیر
دہلی کے حسن پر ہے رنڈاپا ترے بغیر
جمنا ترے بغیر نہ گنگا ترے بغیر
تو گم ہوا تو اشک ہمارے نکل پڑے
جب چاند چھپ گیا تو ستارے نکل پڑے

(مرثیہ نہرو)

یہ مرثیے، درد کے اس سفر سے عبارت ہیں، جس سے شاعر گزرا ہے۔ احساس کا یہ سفر، ان مرثیوں میں درد اور اثر پیدا کر دیتا ہے۔ جوش نے شخصی مرثیہ کی شعریات میں نئے رنگ گھولے ہیں۔ ان کی یہ نظمیں، بلاشبہ شخصی مرثیہ نگاری کی روایت کو طاقت دیتی ہیں۔ اسے آگے بڑھاتی ہیں۔ ان میں، شعریات اور متخیلہ کے وہی، رنگ ہیں، جو جوش کی شناخت ہیں۔ ان میں، فکر وفن کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان مرثیوں کا، اپنا فکری پس منظر بھی ہے۔ یہ لئے کہیں ظاہر ہوتی ہے، تو کہیں بین اسطور چھپی ہوئی ہے۔ محمد علی جوہر کے مرثیہ میں جد جہد آزادی، گاندھی جی کے مرثیہ میں فرقہ وارانہ میل جول پر خطرہ، نہرو کے مرثیہ میں جدید ہندوستان کی تعمیر و تشکیل پر برے اثر کا، اندیشہ اور حکیم صاحب عالم کے مرثیہ میں اپنی ناکامی اور مٹھگے جانے کا احساس، سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی چیزیں، ہم عصر شخصی مرثیہ گو شاعروں میں، الگ مقام دیتے ہیں۔

☆☆☆

جوش ملیح آبادی کی شاعری میں عورت کا تصور

محمد مستمر

تخلیق عورت کے روزِ اوّل سے ہی مٹی کا یہ پتلا جسے مرد کہا جاتا ہے اس کا دیوانہ، دارادہ اور پرستار نظر آتا ہے۔

اس کے حسن اور جوبن کا شیدائی اور پجاری ہے۔ ذہن اور لاشعور کے پردوں پر نقش ثبت کیے ہوئے ہے۔ عورت کے وجود کے باعث بڑے بڑے معرکے، کارنامے اور شاہ کار منظر عام پر آئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی شاید مبالغہ نہ ہو کہ ابوالبشر کے وجود میں آتے ہی اس سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے چنانچہ آدم کی چاہت اور تمنا کے موجب حوا کا اظہار ہوتا ہے۔ نیز یہ خاصہ ہر انسان کے آب وگل اور خمیہ میں پیوست اور گھلا ہوا ہے، جو بچپن سے ہی مرد ذات کے لاشعور میں ہوتا رہتا ہے جس کو وہ اپنے سعور کے ذریعہ کبھی بھی روئے کار لا سکتا ہے اور شاعر اس کام کو بحسن وکوبی ادا کر سکتا ہے۔ جس حساس طبیعت کا وہ مالک ہوتا ہے عام انسان اس سے محروم ہوتا ہے۔ گو ہمارے اردو ادب میں قدیم شعراء سے ہی عورت کا تصور کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے۔ کائناب غزل میں اسے خاس کر محبوب کے روپ میں پیش کی گیا ہے لیکن بیسویں صدی تک آتے آتے وجودِ زن پر عنوانی نظمیں سپرد قلم ہونے لگیں اور ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے چنانچہ بیسویں صی کے کم وپیش شعراء میں شاد ونادر ہی کوئی ایسا فنکار ہو گا جسنے اپنے لاشعور وتحت الشعور میں تبت نقوش کو صفحہء قرطاس پر اہ☆ کرنے کی سعی ☆ نہ کی ہو۔

جیسا کہ بقول اقبال "وجود زن سے ہے خ☆ کائنات میں رنگ" حقیقت اسی

عورت کے وجود سے اس فانی دنیا میں بہار ہے جس سے ہماری سماجی معنویت بھی مستحکم اور برقرار ہے نیز یہ سماجی معنویت ادبی رشتے سے منسلک ہو جاتی ہے۔ ماضی ہو یا حال یا آنے والا کل یعنی مستقبل ہمیشہ عورت کی سماجی وادی معونیت برقرار رہے گی۔ عورت کا تصور ہمارے اردو ادب میں کیا دنیا کے ہر ادب میں اتنا ہی میرا نا ہے جتنی کہ ہر ادب کی دیرینہ حیثیت۔ جوشؔ ملیح آبادی جو شاعر انقلاب سے زیادہ متدارف ہیں ان کے یہاں بھی عورت کا تصور فراوانی کے ساتھ ملتا ہے۔ جوش اسے معاملے میں مدہوش نظر آتے ہیں۔ اس سے قبل ہم جوش کے یہاں تصور عورت کا احاطہ کریں اور اس پر سیہ حاصل گفتگو کریں چند شعرا کا تذکرہ بی کرتے چلیں جنھوں نے اپنے اپنے یہاں عورت کا فلسفہ یا توصیف وتعریف بیاں کی ہے تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ جوش صاحب ان سے کس قدر مستثنیٰ حیثیت کے مالک ہیں۔ لمبی چوڑی بحث کرنا پر امقصد نہیں، مخصوص شعراء کے متعلق ایک دو دو باتیں یا جملے کہتا چلوں گا جو ان کی شاعری میں تصور عورت کے حوالے سے پائی جاتی ہیں۔ عورت کو ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز اور نقطۂ زادیے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالؔی پانی پتی اس کو حیا اور تعدس کی کیف ☆ چادر اڑھانا چاہتے ہیں اور قدم قدم پر اس کی پارسائیت اور عفت کو سامنے لاتے ہیں۔ اقبال قرآن وحدیث کی روشنی میں عورت کا فلسفہ کو بیان کرتے ہیں اور ان کا یہ مندرنہ ذیل شعر

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

میں سمجھتا ہوں اب تک شاعروں نے عورت کا جو تصور اپنے اپنے یہاں بیان کیا ہے ان سب پر بھاری پڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اختر شیرانی نے نوجوانوں کے مسائل اور دلچسپی کو سامنے رکھتے ہوئے رومانیت کی حسین فضا قائم کی اور سلمیٰ، ریحانہ اور غدرا کو تمثیل منا کر اپنے جذبات کو آفاقی جذبات بنا دیا ہے۔ مجاز لکھنوی بھی اختر شیرانی کی طرح حسن کے پرستار ہیں اور سلمیٰ ریحانہ اور غدرا کو نامعلوم وادیوں میں تلاش کرتے ہیں مگر شیرانی کے یہاں جنسی جذبہ نظر نہیں آتا اور مجاز کے یہاں جنسی جذبے کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری کی سرنگاررس کی

رباعیات اس ضمن میں اہم مقام رکھتی ہیں انہوں نے ان رباعیات کے وسیلے سے جو عورت کے جو پیکر اپنے یہاں مرتسم کیے ہیں ان میں جگہ جگہ جنسیات کا جذبہ پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہے لیکن انہوں نے جنسی جذبہ کو دیو ملائی عناصر کی رو سے اس رح پیش کیا ہے کہ زبان گنگا جمنا ہوگئی جو تصور عورت کے معاملے میں ان کا سب سے جدا انداز ہے۔قتیل شفائی عورت کے مختلف اعضا کا ذکر کرتے ہیں لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے طوائف کو مرکزی حیثیت دی ہے جو شاعری میں کبھی کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔کیفی اعظمی اپنے مزاج اورشن کے مطابق عورت کو ترقی پسند تحریک کی سرگرم کارکن دیکھنا چاہتے ان کا یہ مشہور مصرع ''اُٹھ میری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے'' اس بات کی ضمانت دیتا ہے۔احسان دانش ''جوشاعر مزدور'' سے اردو دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ان کے یہاں اگر عورت کے ہر اعضا کی تعریف کی گئی ہے تو دوسری جانب وہ عورت کو ایک دیوی اور دکھیاری کے روپ میں پیش کرتے ہیں خاص طور سے دیہاتی عورتیں اور دوشیزائیں ان کے قلم کی زد میں آتی ہیں جن میں ہندوستانی عورت کی معصومیت اور ایثار مینہاں ہوتا ہے۔

جوش ان سب سے جدا اور نرالے انداز بیان اور اسلوب کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ جوش کی کائنات شاعری مختلف مہتوں کی ترجمانی کرتی ہے۔دیگر شعرا کی طرح جوش بھی عورت کے تصور کو اپنی شاعری میں بیاں کرتے ہیں۔لیکن ان کی شاعری میں عورت کا تصور متذکرہ گذشتہ شعرا سے ضد انظر آتا ہے۔وہ عورت کو کیفی کی طرح نہ آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں اور نہ احسان کی طرح عورت کے ایثار وقربانی کی پیش کرتے ہیں بلکہ جوش عورت کے اس روپ کو مزید متشکل کرتے ہیں جسے دیکھ کر مردی رگ جاں میں وسوسے اور فتنے پیدا ہوتے ہیں اور ایمان خطرے میں پڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔نفسیاتی پیچ وخم اور الجھاؤ عورت کے معاملے میں اظہر من الشمس دکھائی دیتا ہے۔وہ نفسیائی مریض دکھائی دیتے ہیں۔ان کا لاشعور بے قابو رہتا ہے۔نفس مطمئنہ میں وہ صفر نظر آتے ہیں ان کا نفس امارہ نجس کشی کے بجائے بعض دفعہ ☆ بشا نظر آتا ہے۔وہ باریک بینی سے عورت کے ایک ایک عضو کا ذکر حرف بہ حرف کرتے ہیں۔جس میں جوش ذاتی مشاہدہ اور تجربہ شامل ہوتا ہے۔عورت کے حوالے سے انکی نظمیہ شاعری میں نفسیات کے پیچ وخم کا ایک طویل

سلسلہ ہے۔ جس میں جوش نے یہ نفس نفیس اس کے حوالے کر رکھا ہے اور یہ کیفیت کلی طور سے ہے۔

عورت کے حوالے سے جوش نے تقریباً 35 نظمیں سپرد قلم کی ہیں۔ جن میں نفسی خواہشات اور جنسی ہیجانات صاف نظر آتا ہے۔ وہ الفاظ کے استنباطی عمل سے عورت کے پیکر کو اپنی فنی لیاقت اور چابکدستی سے ایسی مہین چادر اڑھاتے ہیں کہ تجریدی آرٹ کا جنم ہوتا ہے۔ ☆ الفاظ جوش کا اتنا شاندار جامع اور متانت سے بر ہے کہ ایک ایک شعر کو فوٹو گرافی اپنی البم میں عورت کے مختلف کٹ کے مطابق آویزاں کر سکتا ہے۔ لفظوں سے مصوری کرنا بہت مشکل فن ہے لیکن جوش کا یہ کمال ہے کہ وہ نادر، نازک اور پر اثر الفاظ کا ایسے استمال کرتے ہیں کہ شاعری مصوری معلوم ہوتی ہے اور اس مصوری میں شاعر کا نفسیاتی خاصہ ہمیشہ شامل حال رہتا ہے اور قاری کو جمالیاتی وژن اور رومانی انبساط حاصل ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ کیجئے۔

رنگین کلائیون کو جوڑے
چہرے کو ہتھیلیون پر رکھے

(جمنا کے کنارے)

سرادلائی کا سر پر نظر جھکا ئے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل بدن ☆ ہوئے
سیاہ زلف پر آنچل خفیف آبی ہے
برہنہ پا ہے تو ہر نقش پا گلابی ہے

(گنگا کے گھاٹ پر)

دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہیں سروں کی ٹوکری
ہاتھ انگڑائی کی صورت آنکھ شرماتی ہوئی

(جامن والیاں)

ایک نہیں انگنت اشعار ایسے مل جائیں گے کہ جنھیں پڑھتے ہوئے سطح ذہن پر الگ الگ

اسٹائل میں عورت کے بہت سے پیکر نمودار ہوتے چلے جائیں گے اور قاری و سامع کو ایسا محسوس ہوگا کہ ایک فوٹو گرافر کٹ کٹ آواز کے ساتھ کسی حسینہ کی دمادم تصویریں اتار رہا ہے۔ جوش اپنی نظموں میں شاعر فطرت اور شاعر شباب نظر آتے ہیں۔ وہ عورت کے پیکریت اور نقاشی کے عمل میں ایسی نازک اور حسین تشبیہات واستارات استعمال کرتے ہیں کہ عورت کے حسن میں مزید نکھار آتا چلا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی کلام میں بھی فصاحت و بلاغت آتی چلی جاتی ہے۔ جوش کے پاس تشبیہات واستعارات کا ناختم ہونے والا خزانہ موجود ہے۔ وہ عورت کے وجود کا سرتاپا تجزیہ اور نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں اس کے ایک ایک امضا اور حرکات وسکنات کو لفظوں کا ایسا چست اور پر کشش جامہ پہناتے ہیں کہ جس میں ان کی واسنا اور نفسی خواہشات ہمیشہ شامل رہتی ہے۔ وہ عورت سے مکمل طور سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں ان کا قدم جگہ جگہ ڈگمگا تا نظر آتا ہے صرف ڈگمگا تا یا نغرش ہی نہیں ہوتا بلکہ وصل کے لیے وہ متمنی اور متدعی نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ کرے وہ صنم دشمن ایماں
مچلے کسی شب جوش کے پہلو میں دوبارا

(یار پری چہرہ)

دل یکا را آج کیسی آگ سی بھڑکی ہے یہ
مجھ پر اس دن یہ کھلا عورت نہیں لڑکی ہے یہ

(مشغلے کا اثر)

تو یہ توبہ فصلِ گل میں اور میں توبہ کروں!
میں کوئی کا فر نہیں، الحمد ربا العالمین

(دعوت ناؤنوش)

عورت کے پیکر اور خدوخال کو نمایاں کرنے کے لیے جوش الفاظ کا ایسا تفحص کرتے ہیں کہ شاعری نگار خانہ معلوم ہوتی ہے جس میں سامع وقاری سحر آفرینی، مدہوشی اور نشہ و سہ ور کا

احساس کرتا ہے۔ چنانچہ تفحص الفاظ اور استنباطی عمل سے ایک شعر میں کئی کئی تصویریں منعکس ہوتی ہیں۔ یہ جوش کی زبان اور الفاظ پر مضبوط گرفت اور دسترس حاصل ہے کہ وہ عورت کی ایک ہی چیز اور اعضا کو پیش کرنے کے لیے الگ الگ نقطۂ زاویہ سے مرتسم کرتیہیں۔ کہیں وہ لب کو شکر بتائے ہیں کہیں یاقوت سے تشبیہ دیتے ہیں، کہیں گلاب کی پنکھڑی سے۔ جوش عورت کے دارادہ اور حسن کے پرستار نظر آتے ہیں کہیں کہیں تو وہ عورت کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں جس میں جوش کے یہاں سادگی اور اصلیت کے بجائے ☆ کے عمل میں تصنع اور تکلف کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ عورت کی تصویر اتارنے اور اس کی شکل وصورت کو نرید حسین بتانے کے لیے البیلی تراکیب بندی کا استعمال کرتیہیں جس سے نہ صرف عورت کی شبیہ پوری طریقے سے آشکار ہوتی بلکہ اس کی مرقع نگاری میں ندرت اور جدت کا وصف بھی چمکنے دمکنے لگتا ہے۔ پیکر لفظوں اور تشبیہاو استعارات سے صفحۂ قرطاس پر اتاری گئیں تصادیر انگنت پیکر تراشی کو جنم دیتی ہیں۔ ان مرتسم ہونے والی تصادیر سے خمریاتی، سماعی، بصری مشامی روشنی اور مخلوط وغیرہ پیکر تراشیوں کا جنم ہوتا ہے۔ جس میں ساتھ ساتھ جھالیاتی ورومانی جا چھائی ہوتی ہے اور ایک تحریری آرٹ وجود میں آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جوش عورت کو نرگس جاناں، شام شگفتہ تسرین بدن ماہ پیر شیریں اداہ پری رخ حسن ارض اافتاب گل پرہن فسوں گر کا فراداہ نازک بدن، گل رخ، جنون خیز، خوش اندام، گل رنگ، نورس، نوطلعت، زہرہ جبیں، دیرینہ تمناہ وغیرہ وغیرہ لفظوں سے مخاطب کرتے ہیں یہ استعاراتی انداز نہ صرف عورت کے حسن وجمال میں چار چاند لگاتا ہے بلکہ ایسی تصویریں منقوش خاطر ہوتی ہیں جن پر ہر ایک کا دل موہت اور لٹو ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جوش عورت کی آنکھوں میں بت قراری وخمار، کمر میں بل پڑتے ہوئے، ☆ سے گوں میں سرخ لہو، القصہ جسم کے ہر حصے میں عورت کی نفسیاتی حرکت وعمل کو دیکھتے ہیں۔ چندہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:-

وہ یار پری چہرہ کہ شب کو سدھارا
طوفاں تھا تلاطم تھا چھلاوا تھا شرارا
گل بیزو گہر ایز و گہربارو گہر تاب

کلیوں نے جسے رنگ دیا گل نے سنوارا
خوش چشم و خوش اطوار خوش آواز و کوش اندام
ایک کال پہ قربان سمر قند و بخارا
نظریں جو اُٹھا دے تو لرزنے لگے خورشید
ابرو کو جو بل دے تو ہو مہتاب دو پارا
زلفیں تھیں کہ ساون کی مچلتی ہوئی راتیں
شوخی تھی کہ سیلاب کا لڑتا ہوا دھارا

(یار پری چہرہ)

کانوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے
زاہد فریب گُکل رخ کا فردراز مژگاں
سیمیں بدن پری رخ نوخیز حشر ساماں
خوش چشم خوبصورت خوش وضع ماہ پیکر
نازک بدن شکراب شیریں ادافسوں گر
کافرادا ، شگفتہ گل پیرہن سمن بو
سرو چمن سہی قد ، رنگیں جمال خوش رو
صحرا کی زیب و زینت فطرت کی نوردیدہ
برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ

(جنگل کی شاہزادی)

جوش کی نظموں میں تقریباً ۳۵ نظمیں ایسی ہیں جو عورت کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہیں۔ یہاں چنندہ نظموں کا تحریر پیش کیا جائے گا تا کہ جوش کی شاعری میں عورت کے خدوخال واضح ہو سکیں اور اس کی سماجی وادی معنویت کا انکشاف ہو سکے یہ کون اٹھا شرماتا؟" یہ نظم مخمس کے فارم

میں لکھی گئی ہے۔ اس میں عورت کی وہ تصوریں مختلف زاویوں سے کھینچنے کی کوشش کی ہےجب عورت صبح کاذب کے وقت بستر سے اُٹھتی ہے یہاں جوش نے تجاہل عارفانہ انداز اپناتے ہوئے نفسیائی طور سے عورت کی براس حرکت وعمل اور ایکٹی وٹی کا جائزہ لیا ہے جب وہ شکن دراز بستر سے اٹھتی ہے اور متورم پپوٹوں کے ساتھ آنکھوں میں ہلکا ہلکا خمار اور نشہ باقی رہتا ہے یہاں حیرت ہے کہ جوش نے ☆ کی جگہ پپوٹے جے ہوئے کی اصطلاح کہاں سے لی ہے۔ سستی اور آلس اتارنے کے ہیے بدن کو توڑتی مروڑتی ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنچل ڈھلکا ہوا سا ہوتا ہے۔ نظریں نیچی ہوتی ہیں، ایروسٹے ہوتے ہیں، یا نہیں نگی ہوتی ہیں جو مرمری وصف کے باعث دل کو گھایل بناتی ہیں۔ چناچہ ان سب حرکت وعمل کو دیکھ کر جوش کا دل بھی فگار ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔ یہ بند دیکھئے:-

ہلچل میں دل کی بستی ہے
طوفان جنوں میں ہستی ہے
آنکھ میں شب کی مستی ہے
اور مستجا دل کو ڈستی ہے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا؟

''جوانی کی آمد آمد اور ''اٹھتی جوانی'' یہ دونوں نظمیں ایک ہی طرز فکر اور چنالات و تجربات کی غمازی کرتی ہیں۔

عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جوش نے نظموں میں کس طرح کے موضوع کو شعری جامہ پہنایا ہوگا۔ ویسے تو جوش کے یہاں عورت کا جو تصور پایا جاتا ہے اس میں نفسی ہیجانات کی کارفرمائی بدرجہ اتم موجود ہے کچھ نظمیں ایسی ہیں جن کو ہم نفسی خواہشات کے زمرے سے الگ کر سکتے ہے۔ ان دونوں نظموں میں ایسے پیکر ابھارے گیے میں کہ جب عورت ذات میں جوانی کے قریب آنکھوں میں پیشانی پر سینہ پر، عارض پر، لبوں پر، ناک پر، غرض کہ جسم کے ہر حصے میں تغیر وتبدل او ربالیدگی ہوتی ہے ایک اٹھان آتا ہے، آواز بدل جاتی ہے اور وہ سراپا جاذب نظر بن جاتی ہے اور

مردوزن کا ایک دوسرے کو دیکھنے کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب زنانہ ہارمون ایسٹروجن اور اس کی قبل کے زمانہ ہارمون کی کارکردگی جوبن پر آنے لگتی ہے۔ انہی پہلوؤں، زاویوں کو جوش نے ان نظموں مُں بیان کیا ہے۔ ہم ان نظموں کو ٹین ایک Teen) (Age کے زمرے میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ جہاں سے تضاد جنس کی طرف رغبت اور کشش پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہے وہ لاشعور جسے گذشتہ کئی برسوں سے دبا دیا تھا یا جس کی مزاحمت کردی گئی تھی وہ پھر سے نفسی خواہشات و ہیجانات کی شکل میں مودار ہونے لگتا ہے یہ دونوں نظمیں انہیں باتوں کی وضاحت اور غمازی کرتی ہیں اور عورت کے ان پیکروں کا ارتسام کرتی ہیں جو شب و روز چودہ سے اٹھارہ سال کے درمیان آن میں کچھ آن میں کچھ بدلاؤ ہوتا رہتا ہے نیز چہرے پر دکھائی دینے والی معصومیت ہوتی چلی جاتی ہے بلکہ وہ معصومیت حسن و جمال کی آفتابی و مہتابی چادر اوڑھنے لگتی ہے جس کے باعث رخسار و عارض کے رنگ، ہونٹوں کے گلابی پن جھیل سی آنکھوں کی گہرائی زلف و کاکل، کمر قد، سینہ بازو، منجملہ ہر ایک جسمانی اعضا میں تیزی کے ساتھ بدلاؤ دیکھتے ہیں۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش خدمت ہیں:-

گیا لڑکپن نئی جوانی نئی اداؤں سے آرہی ہے
جبیں پہ غنچے کھلا کھلا کر نظر میں دھوم مچارہی ہے
ادائیں پہلو بدل رہی ہیں، ☆ کروٹ سی لے رہی ہیں
سنک رہی ہے ہوائے شوخی، حیا کی لو تھرتھرا رہی ہے
گلاب سے عارضو کے نہ میں مثباب تھم تھم کے پرفشاں ہے
نظر فریب آنکھڑیوں کی رو میں شراب رِس رِس کے آرہی ہے
لبوں پہ وہ سرخیاں ہیں جیسے ہلال دامن میں ہو شفق کے
نظر میں ہے وہ خمار گویا ذرا ذراپتد آرہی ہے

''افشائے راز'' یہ ایک ایسی نظم ہے کہ جب عورت کے جوانی کے نشکے میں اور عنفوانِ شباب کے دوران قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ نیز وہ اپنا جسم مرد کے حوالے کردیتی ہے۔ لیکن تجربیت کا

راپنے تجربے کی بنیاد اور شاہد پر چال ڈھال اور چہرے کے متغیر ہوتے تاثرات سیاندازہ لگا لیتے ہیں۔ جوش نے اس نظم میں عورت کی اسی کیفیت کو نفسیاتی رو سے بیان کیا ہے اور پھر نظم کے آخری شعر میں عنوان نظم کے مطابق تجسس اور معمہ کو فاش کر دیا ہے یعنی جب عورت وصل کے مقام سے گزر کر اور وہ بھی کنواری، حامید سے ہو جاتی ہے اور تے اور مچلی ہونے کے باعث رازِ سربستہ بالکل پشیمائی اور زمیں میں گڑنے والی کیفیت کی پیکر تراشی کی ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:-

کاوش اخفا میں الٹی اور رسوائی ہوئی
کہیئے کیوں اٹھی نہیں آنکھ شرمائی ہوئی

''جمنا کے کنارے'' اور گنگا کے گھاٹ پر'' یہ ایک ہی موضوع پر دو نظمیں ہیں پہلے شاعر نے دونوں نظموں میں گنگا اور جمنا دریاؤں کی منظر نگاری کی ہے بعد ازاں اس حسین نازنینہ عورت کی تصویر کو ابھارنے کی کوشش کی ہے جو اشنان کر کے دریا سے نکلی ہے جس کے بال، گال، لب، جبیں، جسم کے سب اعض پر پانی کے ڈورے اور بوندے ٹپک رہی ہیں۔ اور اس کی ساڑی بھیگ کر بدن سے اس طرح چپک گئی ہے کہ بلور سابدن چمک رہا ہے۔ جسے دیکھ کر جوش کا دل مچلے بغیر نہیں رہتا اور نفس امارہ میں زیادہ شدت پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ عورت کے متعلق نازک اور حسین تشبیہات واستعارات پیش کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:-

مقابلہ جو کرے کوئی چاند پھیکا ہے
جبینِ شموک پہ صندکل کا سرخ ٹیکا ہے
نمی ہے زلف ہیں ، اشنان کر کے نکلی ہے
یہ کس کی موت کا سامان کر کے نکلی ہے
لبوں پر کھیل رہا ہے اثر نہانے کا
گمان ہوتا ہے ہر بار مسکرانے کا
ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں
ادھر بھی ایک نظر میں ترا پجاری ہوں

'مالن، اور، جامن والیاں، دونوں نظمیں غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ان دونوں نظموں میں جوش نے گاؤں سے متعلق ان عورتوں کا ذکر کیا ہے جو ایک مالن ہے اور جامن والیاں ہیں۔ مالن جس کا کام باغ سے پھول چننا ہے۔ نظم مالن میں مالن کے ان تانیتی پیکر اور تصاویر کا ارتسام کیا ہے جب مالن باغ سے پھول توڑ کر اٹھلاتی ہوئی پگڈنڈی پر بار بار انکھیں اٹھائی ہوئی، زیر و بم سانس لیتی ہوئی راستہ تنگ اور نیڑا ہونے کی وجہ سے بڑی احتیاط سے پیر رکھتی ہوئی کہ تباشا بھی پھوٹ نہ پائے اس نزاکت سے آنچل میں پھول لیے ہوئے آستین چڑھی ہوئی یا نہوی سے کاندھے پر آنچل ڈالی ہوئی بھاگتی رہتی ☆ بال بکھرائی ہوئی ان سب فعل اور حرکت کے ساتھ شاعر کے غنچہ دل کا چنکاتئ ہوئی آرہی ہے۔ایک ساتھ الگ الگ استخل میں ایک ہی عورت کی انگنت تصویریں اس طرح آنکھوں کے سامنے پھرتی ہیں کہ جیسے ایک پر دوہ س ☆ پرکس حسینہ کے پل بھر میں پلک جھپکتے ہی بہت سے شاٹ لے لیے گئے ہوں۔ چنانچہ جوش اس دیہاتی مال میں رنگ ونور اورحسن و جمال کی برسات ہوتی دیکھتے ہیں اور ہائے کے ساتھ وہ اسے چاندی ہیکل بتاتے ہیں۔ جامن والیاں نظم مُس بھی جوش کی یہی مر مٹنے والی کیفیت ہے۔جوش جامن والیوں کو عمر کے ن ☆ میں نیند میں ڈوبی ہوئی، برق کی ہلچل کے باعث کچھ کچھ ہوش میں آئی ہوئی بتاتے ہیں۔اور جب یہ جامن والیاں شہر میں گھوم گھوم کر جامن بیچتی ہیں تو لوگوں کی اٹھی ہوئی نظر بار بار نظروں سے وہ جھجک جاتی ہیں جو نسوائی خاصہ ہے۔ نیز جامن والیوں نے اپنے نازک ہاتھوں سے سر پہ رکھی ٹوکری کو جس انداز سے پکڑ رکھا ہے وہ شعر ملاحظہ کریں۔

دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہیں سروں کی ٹوکری
ہاتھ انگڑائی کی صورت ، آنکھ شرماتی ہوئی

''جنگل کی شہزادی'' اور فتنہ کانقاہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ جنگلکی شہزادی جوش کی آپ بیتی ہے اور فتنہ خانقاہ میں ایک واقعہ کو بیان کیا ہے۔منظر نگاری اور بلاغت دنوں نظموں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جنگلکی شاہزادی اور فتنہ خانقاہ میں مماثلت بھی ہے اور تفاوت بھی ہے مماثلت یہ ہے کہ دونوں نظم میں فتنوں اور الدتقائے شہوانیت کی بات کی گئی ہے جو حسین

خوبصورعورت کے سبب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ تفلوت یہ کہ جنگل کی شہزادی میں شاعر بنفسیں نفیس عورت کو عیکھ کرڈلواڈول ہوتا ہےاورایمان خطرے میں پڑ تا ہوادکھائی دیتا ہے یہاں شکوہ اور حرف زنی اس لیے نہیں کی جاسکتی کہ شاعرتو پہلے سے ہی حسن کا پجاری ہےاور نہ ہی نفس کشی کی کیفیت میں ہے لیکن فتنئہ خانقاہ میں زاہدہ و عابداور بڑے بڑے متقی و پرہیز گاراپنی پارسائیت کو عورت کی ایک جھلک میں کھو بیٹھتے ہیں۔ بل بھر میں انکی تپسّیا بھنگ ہوجاتی ہے۔ایک عورت جو خانقاہ میں فاتحہ پڑھنے کے واسطےاائی ہوئی ہےاوردورانِ فاتحہ جوکام وہ انجام دیتی ہے جوش نے نفسیاتی شعور سے اسے پیش کرنے میں بڑی زرف نگاہی کا کام لیا ہے جس سے اس عورت کے کئی شیڈز نمودار ہوتے ہیں۔ اور یہ شیڈز کانقاہ میں ے والے، عبادت و ریاخات اور حرب لگانے والے زہدوں اور متقیوں کی تسبیح بھی ہاتھ سے گرادیتے ہیں۔ نیت حراب کر دیتے ہیں اور انکی پارسئیت کوملیامیٹ کردیتے ہیں:۔بند دیکھیئے

ہر چہرہ چیخ اٹھا کہ ترے ساتھ جائیں گے
اے حسن تری راہ میں دھونی رمائیں گے
اب اس جگہ سے اپنا مُصلٰی اُٹھائیں گے
قرباں گاہِ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے
کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہونگے تری بار گاہ میں

'ضعیفہ' اور'' بیابن ناگن کالی رات'' دور حاضر کی بالکل سہی ترجمائی کرتی ہیں۔ ان نظموں میں آج کے سماج اورمعاشرے کی بچی تصویریں سامنےآتی ہیں۔ حالانکہ دونوں نظموں کے موضوع مختلف ہیں لیکن دونوں نظموں میں جوش نے سماجی ومعاشرتی جائزہ بڑے فنی طریقے سے لیا ہے۔نہ ضعیفہ ایسی نظم ہے جسے آج کے خودغرض سماج نے بےکارکی کی چیز سمجھ کرگھر سے باہرنکال دیا ہے۔جس کا پنا پریوار ہے بیٹے ہیں بہوئیں ہیں لمبا چوڑا بھرا کنبہ ہے۔اس موضوع کوفکرخواں بنا کرکشمیری لال ذاکر نے بھی ''اب یہی مرا گھر ہے'' کے عنوان سے افسانہ سپردقلم کیا ہے اگرنظم کا

چٹخارہ لینا ہے تو جوش کی متذکرہ نظم پڑھیے اور اگر نرہ سے لطف اندوز ہونا ہے تو ذاکر صاحب کا افسانہ ''اب یہی میرا گھر ہے'' کا مطالعہ کیجئے۔

ضعیفہ میں، جوش نے سماجی دتشدادادر جنیریشن گیپ(Generation Gap) کوسامنے رکھتے ہوئے یہ نظم تحریری کی ہے۔ چنانچہ نظم و پڑھتے وقت ایک ایسی دکھیاری بے بس مایوس بے یارو مددگاراورتن تنہا کی تصویراور مرقع کھینچا ہے جسے جوش سرراہ مٹی پر لیٹا ہوا پاتا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں ملاحظہ فرمائیں:-

اک ضعیفہ راستے میں سو رہی ہے خاک پر
مردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غمناک پر
عبرت و دہشت کا خنجر ہے دل غمناک پر
پائے یہ بیت دم پڑا ہے کون ٹھنڈی خاک پر
آہ اے بت کس ضعیفہ ! غم کی تڑپائی ہوئی
اے زمانے کی جھنجھوڑی، زر کی ٹھکرائی ہوئی
تیرے بچے رے گردوں کے ستارے کیا ہوئے
اے ضعیفہ! تیری پیری کے سہارے کیا ہوئے
سو رہا ہے تیرا وارث کس طرف پہنے کفن
دفن ہے کس دیس میں ترا عروسی بانکپن

''پیا بن ناگن کالی رات'' آج کے اس سماج کی عکاسی کرتی ہے جن عورتوں کے شوہر بیرون ممالک میں روزگار کے سلسلے میں کام کرر ہے ہیں اور جن کو اپنی عورتوں کی کوئی فکر نہیں۔ یا تو وہ نسوانی نفسیات سے واقف نہیں یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جولوگ اس نظم کا مطالعہ کریں گے ایسے لوگ اس نظم کا مطالعہ کریں گے ایسے لوگ ضرور اس نظم سے عبرت حاصل کریں گے۔اس نظم میں عورت خود متکلم کی حیثیت سے اپنے نفسیاتی پیچ وخم اورارتقائے شہوانیت کی کہانی سناتی نظر آتی ہے عورت کے بیانیہ لہجہ سے بہت سے واسنا سے پُر شیڈز منعکس ہوتے ہیں۔

جس سے سننے اور پڑھنے والے کے دل میں بھی ہلچل اور بدن میں بجلیاں سی دوڑنے لگتی ہے اور قوت باہ برانگی ☆ ہوتی ہے۔ اک نظم میں عورت اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کس طرح دن کاٹتی ہی اور اپنی نفسی خواہشات کو لاکھ دبانے پر بھی نہیں دبا پائی اور جب خواہشات کو جنم دینے والا ماحول بناتا ہے تو داسنا کی آگ اور بھڑک جاتی ہے۔ اسی لیے اس نظم میں یہ پیا بنوالی عورت ☆ کو تان لگانے سے، برساتی بادل کو گرجنے سے، گھٹاؤں کو بوندے ٹپکانے سے، موروں کو شور کرنے سے روکتی ہے ان امواراور افعال کے باعث اس نفسیاتی جذبات اور زیادہ بھڑکنے لگتے ہیں نیز ایسی عورت رہ رہ کے الگ الگ پر کشش اور فگارانہ ☆ کے ساتھ تنہائی کے عالم پیا بن بے قابو ہوئی جاتی ہے۔ چندہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:-

اے ترو تازہ حسر تو! بن کی
اے سلما بی گھٹاؤ! ساون کی
جلدی اس دیس سے گزر جاؤ
وادی، اک لوند بھی نہ ٹپکاؤ
ورنہ مہکیں گے پھول گلشن میں
آگ لگ جائے گی مرے تن میں
بول نہ پاپی پپیہے تان لگا!
جس نگر میں ہیں پی ، وہیں اڑجا
یون ہی چھاتی جو دھڑکی جائے گی
ہائے کس طرح نیند آئے گی

''یہ شہاگن بیوہ' یہ جوش کی الگ نون کی نظم ہے۔ اس میں ارتقائے شہوانیت کی بجائے فنہ ☆ اور تصوف کے رموز اسرارت جوش نے بات کی ہے۔ یہاں جوش کے تخیل کی پرواز دوسری سمت اختیار کر لیتی ہے۔ حار جیب کے بجائے داخلیت کا وصف نمایاں ہوتا ہے۔ گویا عورت کو جارجٹ کا پشمینہ پہنانے کے بجائے پارسانیت کی گف اور ک ☆ اڑھانے کی کوشش کی ہے۔

سہاگن بیوہ مُس بھی متذکرہ نظموں کی طرح پہلے تمہید باندھتے ہوئے منظر نگاری کی ہے اس کے بعد اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ اس نظم میں جوش نے اس عورت کی تصویریں صفحہ قرطاس پر اتارنے کی کوشش کی ہے جو شادی سے اگلے دن ہی بیوہ ہو جاتی ہے جس کے ہاتھوں کی مہندی اور سرخ جوڑے مُس بھی کوئی حرف نہیں آیا ہے۔ وہ دریا کے کنارے شمشان گھاٹ میں اپنے پتی دیو کی چتا کے پاس بیٹھی اپنی زندگی اور قسمت ☆ لعن طعن کر رہی ہے زندگی سے شکوہ کر رہی ہے جسنے دیکھ کر شاعر کا دل بھی پسیج جاتا ہے بیوہ کا کرب وآہ وبکا اس سے دیکھی نہیں جاتی وہ بیوہ عورت جوہر پرتھا کو انجام دینا چاہتی ہے مگر جوش اس کو بڑھ کر اس کا رگناہ ہے روک لیتے ہیں۔ اور اسے ☆ کا عرفان کراتے ہیں۔ زندگی اور موت کے فلسفہ بتاتے ہوئے اقبال کا اثر قبول کر لیتے ہیں اور اشعار پر اقبال کا چیر بہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح اقبال اپنی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' فنا اور بقا کے راز سربست کو میاں کرتے ہیں اسی طرح جوش بھی اس سہاگن بیوہ کو راہ راست پر لانے کے لیئے ا☆ کو اختیار کرتے ہین۔ یہاں آکر دہاڑے مار مار کر رونے کی حالت میں بال بکھرے ہوئے، رخسار پر آنسوؤں کے ڈورے یہ مختلف حرکات واقعاں سے جو تصویریں نظروں کے سامنے نظم کو پڑھ کر آشکار ہو رہی تھیں۔ اب وہ مقدس جلیل القدر اور تیجسوی کے روپ میں نمودار ہونی ہے جیسے کوئی ساکشات کمالاتی اور کراماتی دیوی کھڑی ہو۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

☆☆☆ہم وہ فنا ہوتے نہیں
مرنے والے ☆ میں ہم سے جدا ہوتے نہیں
قید ہستی سے کوئی ذرہ رہا ہوتا نہیں
ٹوٹ جاتا ہے قفس، طا☆☆ نہیں
عشق کے مالے کا اک موئی بکھر سکتا نہیں
اتحاد ماطنی مرنے سے مر سکتا نہیں
زندگی دھنہ لاشا جلوہ ہے اور کچھ بھی نہیں
موت ایک بار☆ سا پردہ ہے اور کچھ نہیں

خاک فلسی کی نظر سے رشک گلشن ہوگئی
معرفت میں ڈوب کر بیوہ سہگن ہوگئی !!

''خاتون مشرق'نظم میں بھی جوش نے معرفت وحقیقت کے منہاج کواپناتے ہوئے عورت کی وہ پاکیزہ تصوری ابھارنے کی کوشش کی ہے کہ جس کو جوش آخرت پرایمان رکھنےاور وہاں کی نازونعت کا یقین دلاتے ہیں اور سب سے بڑی دونوں جہاں کی وہ نعمت و دولت کہ جسے خدا وحدہ لاشریک اپنے عرش کے سائے میں پناہ دیں گے۔خاتون مغرب نظم بھی آج کے سماج کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتی ہے مختصر یہ کہ جس برابری کی آج عورت جمہوری نظام سے اپیل کررہی ہے اور آگے آنے کے معاملے میں یعنی چراغ کانہ کی بجائے شمع محفل والی کیفیت سامنے آرہی ہے یز ☆ کے مقابلے میں اپنی ذات کو برابر کی حقدار سمجھ رہی ہے۔ چنانچہ جس طرح آج ہم ☆ گروپ کومردانہ لباس سے مزین چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں نفاست اور نزاکت کے نسوائی صف کومعدوم ہوتے دیکھ رہے ہیں جوش نے ۲۱ویں صدی کے متغیر ہوتے اس کاروان نسواں کو بڑے نفسیاتی طور سے''خاتون مغرب نظم میں پیش کیا ہے۔لیکن جوش تب ☆ نفسیاتی سمندر میں غوطہ زن ہوتے دکھائی دیتے ہیں جب وہ ☆ غروب کومردانہ رکھ رکھاؤ کے باعث عورت کے چہرے کا نورمعدوم ہوتا دیکھتے ہیں۔نیز عورت ایک خوجہ سی دکھائی دینے لگتی ہے۔شعر دیکھیئے :۔

اپنے سینے کا خزانہ ، اپنی فطرت کا جمال
مرد بننے کی ہوس میں کر دیا ہے پائمال
ناز کی عزت، محبت آبرو ، کچھ بھی نہیں
نام تو ہے پھول لیکن رنگ دیو کچھ بھی نہیں

''حسن اور مزدوری بھی جوش کی نمائندہ نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔اس میں جوش نے عورت کے حسن اور ☆ کشی کے مخلوط پیکر کو نمودار کیا ہے۔ نظم کے پہلے ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ہایک اسی عورت کی تصویر کوابھارتا ہے جو چلچلاتی دھوپ میں پانے حسن اور جوانی کی پرواہ کیے بنا مجبوری کے باعث کنکر کوٹ رہی ہے۔جوش نے ان مروں ☆ کی

شبیہ کو من ☆ ☆ کرنے کے لیے نہایت نازک اور خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنایا ہے جس کے وجہ سے چھیڑوں میں بھی ابھرنے والی اس عورت کی تصویر قاری کے لیے جاء☆ نظر☆ ہوئی ہے۔ چنانہ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ہندوستان کی قسمت پر لعنت بھیج رہا ہے۔ شعر دیکھئے:۔

نازمینوں کا یہ عالم، مادرنہ ☆! آہ آہ!
کس کے جور نار وانے کردیا تجکو تباہ؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

'بوڑھا شوہر' نظم میں عورت متکلم کی حیثیت سے خود اپنے نسوائی خامسے اور نفسیاتی نشیب وفراز کو بیان کرتی ہے۔ چند لفظوں میں اس کی کیفیت میں کا کروں رام مجھے بڑھا مل گیا موالی جیسی ہے۔ بوڑھا شوہر کو متکلم عورت اپنی کمسن کے لیے موت بتاتی ہے وہ تسکین جسم کے معالمے میں بوڑھے شوہر سے مطمئن نہیں ہوئی بھکارن شاہزادی، میں جوش نے'' ملے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے، کی روشنی مین اس شہزادی کی داستان بربادی بیاں کی ہے جو قسمت کے ہاتھوں محتشم اور ناز ونخرے والی بھکارن بن گئی ہے۔'' رفیقہ حیات سے''، نظم میں جوش اپنی بیوی سے مخاطب نظر آتے ہیں جس میں چشمک ہے اور شوخی وشرلات کا عنصر بھی تحلیل ہے۔ بہن کی یاد میں نظم جوش کی بہن کی نئیں محبت وخلوص کو نمایاں کرتی ہے۔ جس میں یاداواشتی وپیکر تراشی سے جوش نے بہن کی تصویر کو ☆ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر نیچی نگاہیں، جوانی کا تقاضا، ☆ ایک تمنا، آتے نہیں ہو☆ تیرے لیے روپ متی الٹھر کامنی بی اسی نوع کی نظمیں ہیں۔

چنانچہ ہم جوش ملیح آبادی کے کلام کے مطالعہ سے اس مال پر پہنچے ہیں کہ جو تصور انہوں نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے دور حاضر میں بھی اس کی ادبی وسماجی معنویت برقرار ہے۔ کچھ نظمیں تو ایسی ہیں جو آج کے سماج ومکاشرے کی بالکل صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ اور آخر میں وہ مختصر نظم بھی پیش کرتا چلوں جو'عورت' کے عنوان سے لکھی گئی ہے جس میں جوش نے عورت کے متضاداو صاف کو کشمکش اور تذیذب والی کیفیت کے ساتھ بیان کیا ہے اس چار اشعار کی نظم میں ایک نہیں

انگنت معنویت پنہاں ہیں آپ بھی لطف اندوز ہوتے چلیے:-

کرم آشنا ہے سفاک ہے
بہر رنگ عورت خطرناک ہے
اگر جو رپر ہے اور تبدن خو
بہاتی ہے اہل نظر کا لہو
اگر مہر باں ہے توا ے ہم نشیں
فنا کر کے مرنے کبھی دیتی نہیں
جو بھاگے گا اس سے اماں پائے گا
نہ بھاگا تو کم بخت پچھتائے گا

☆☆☆

جوش کا تصورِ عظمتِ انسان

نعیم السحر صدیقی

اس سچائی کو ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ جوش کی شاعری کا ارتقاء فنی اور فکری دونوں لحاظ سے ہموار اور یکساں انداز سے نہیں ہوا۔ اس میں کئی طرح کے تضادات اور نقائص راہ پا گئے۔ اس صورتِ حال کے اسباب ان کی تعلیم و تربیت کے جاگیردارانہ پس منظر اور اُن کی سیرت کی رومان پرستی میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس بات میں جتنی حقیقت ہے اُتنی ہی حقیقت اِس بات میں بھی ہے کہ انسان دوستی، فطرت کے حسن سے وابستگی، وطن پرستی اور بنی نوع انسان کی عظمت اور وحدت کے میدان میں اُنہوں نے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ کبھی اُن کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ اور آہستہ آہستہ اُن کی سماجی فکر میں یہ تصورات زیادہ استحکام حاصل کرتے گئے۔

جہاں تک انسانی عظمت کے تصورات کا تعلق ہے۔ مغرب اور مشرق میں اس کے کئی نظریے رہے ہیں۔ مغربی ادب میں یونانی تمثیل نگار سوفاکلیز سے لے کر برطانوی ادیب چارلس ڈکنس تک بیشتر ادیب انسان کو مرکز کائنات سمجھتے ہیں۔ اُن کا موقف یہ ہے کہ انسان کی فلاح کے لئے فطرت اور کائنات کی ہر شئے کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ مشرق خصوصاً ہندوستان میں انسان خود فطرت کا ایک حصہ ہے۔ اِس کا دوست ہے اس لئے یہاں فطرت یا دوسری مخلوقات سے انسان کے رشتے بے حد دوستانہ رہے ہیں۔ اِسی نے اہنسا اور عدم تشدد کے تصورات کو جنم دیا۔

جوش بلاشبہ ہندوستان کے عظیم شعراء کالیداس اور سنت کبیر سے لے کر نظیر اکبرآبادی

تک انسانی عظمت کے بارے میں ہندوستانی روایت کے وارث تھے۔لیکن جوشؔ عہد حاضر کی تعقل پسندی اور سائنسی بصیرت سے بھی انسانی عظمت کا مینار تعمیر کرنے میں فیض اُٹھاتے ہیں اور اس طرح سے جدید فکر سے قریب آجاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جوشؔ کی باغیانہ اور انقلابی شاعری میں بھی انسان کی عظمت کا جوہر پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے ایک مضمون میں صحیح لکھا ہے:

''جوشؔ کی انقلابی شاعری کا اوّل وآخر حوالہ عظمت انسان ہے۔اور جوشؔ نے اس عظمت کے عرفان کے لئے قدرت شناسی پر زور دیا ہے۔''

''جوشؔ ملیح آبادی:ایک مطالعہ'' ص 47

جوشؔ اپنی نظم ''عظمت انسان'' میں کہتے ہیں:

مرغ زارو چمن و وادیُ و کوہ و صحرا
سبزۂ و شبنم و ریحان و گل و سرووصبا
ذرّۂ و اختر و مہر و مہ و دشت و دریا
سب یہ گونگے ہیں اُٹھائے ازلی سنّاٹا
کرۂ ارض و سما کھول رہا ہے انساں
اِس خموشی میں فقط بول رہا ہے انساں

یہ ایک بند ہی اِس کائنات میں انسان کی قدرت اور عظمت کے سارے پہلو اُجاگر کر دیتا ہے۔ گویا فقط انسان ہی ہے جو اِس کائنات کے بھید اور قدرت کے اسرار کھول کر انسانی زندگی کو خوبصورت اور بابرکت بنارہا ہے۔ جوشؔ کا ایمان تھا کہ انسان کی تخلیقی توانائی کے اظہار کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلامی سے نجات پائے، اُسے جمہوری آزادی میسر ہو۔لیکن اُنہیں اس حقیقت کا بھی علم تھا کہ یہ آزادی کبھی کبھی ایک نئی غلامی میں بدل جاتی ہے۔'' آیات ونغمات'' اور'' عرش وفرش''، جس میں جوشؔ کا لہجہ قدرے نرم اور سنجیدہ ہے۔ یہ سنجیدگی عمر کا تقاضہ بھی ہوسکتی ہے اور وقت کا بھی کہ اب ملک کی خستہ حالی اور غلامی کے موضوعات کو شاعر کی نظریں گہرائی سے دیکھ چکی

تھیں۔اوراس مشاہدے کا نتیجہ شاعر کے نزدیک یہ برآمد ہوا تھا کہ انسان مجبور محض بھی ہے اور ظالم وجابر بھی۔اسی لئے نظم 'فطرت اقوام' میں لکھتے ہیں:

ظلم لا انتہا سے تنگ آکر آدمی چاہتا ہے آزادی
پا کے اپنے حقوق اوروں کے چھینتا ہے حقوقِ بنیادی
پہلے تو ظالموں سے ڈرتا ہے اور پھر خود ہی ظلم کرتا ہے

بہ عنوان 'ایک طویل نظم' میں آدم کے نام سے جو حصہ مخصوص ہے وہ انسان کی قوت اور دائرہ عمل، انسان کی دلچسپیوں اور کیفیات کو بیان کر کے نوع انسانی کو حرکت اور عمل کی تلقین کرتا ہے۔حضرت آدم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان کی کوششوں اور سرگرمیوں سے یہ دنیا خوبصورت اور ترقی یافتہ ہے گویا انسانی عظمت اوراس کے ممکنات کے احساس کا تاثر یہ نظم قائم کرتی ہے۔اور حقیقت ورومان کی آمیزش سے اپنی تکمیل کرتی ہے۔نظم کا ماحصل بھی یہی ہے۔اس نظم کی ابتدا میں فرشتوں کا جواعتراض ہے اس میں جوش کے اپنے دل کی کسک بھی شامل ہے۔ایسا لگتا ہے کہ جوش بھی ان معترض فرشتوں کے ہم زبان ہیں۔ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس طرح کے نکتہ آفریں مکالمات سے جوش کی شاعری بھری پڑی ہے۔جو فساد، سرکشی اور بدکرداری و بدنظمی کے ذمہ داروں کو دیکھ کر ہمیشہ ان کے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ایک مثال پیش ہے:

ماسوااس کے ضمیر آب وگل میں ہے جنوں
خاک پر تیری بہائے گا شقی انسان خوں
حشر تک بوتا رہے گا کشف جاں میں تخم شر
اور کبھی انجام سے بھی یہ نہ ہوگا بہرہ ور
طبع عالی پر گرانی ہوگی بے حد وحساب
فتنہ خوابیدہ کو رہنے بھی دے مصروف خواب

معترض فرشتوں کو خدا کا جو جواب ملتا ہے وہ بھی جوش کی شاعری میں خصوصیت سے ادا ہوا ہے۔یعنی انسان کی عظمت اور مرتبہ کا احساس۔مثلاً:

ہاں میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی
کون انساں ؟ناز مخلوقات وفخر زندگی
شاہِ گیتی ،صاحبِ آفاق، دارائے حیات
ابر رحمت، وارث فطرت، رئیس کائنات
روشنی کا نغمہ،فطرت کا سخن،حق کا پیام
مہر و مہ کا مقتدا،سرکش عناصر کاامام

جوش کے مجموعے الہام وافکار میں بھی زندگی انسان ،انسانی وحدت اور تعقل پسندی کی ترجمانی کرنے والی چند شاہکار تخلیقات شامل ہیں۔مثلاً اکتارا، زندانِ مثلث، اے نوع بشر جاگ، امواج تخیل، آدمی نامہ ،موجد ومفکر، لافانی حروف اور شادیانہ جیسی تخلیقات نہ صرف جوش کی بلکہ اردو شاعری کی سدا بہار قدر و قیمت رکھنے والی شاہکار نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جوش کی نظموں کا مشترک اور اساسی موضوع بنی نوع انسان کی عظمت کا تصور اور کائنات کو زیر دام لانے کی اس کی قدرت ہے۔جوش کے دوسرے مجموعوں میں بھی عظمت آدم کا موضوع بہ تکرار ملتا ہے لیکن الہام وافکار میں اسے مزید دلکش شعری و تخیلی پیکروں میں سجا کر پیش کیا ہے،مثلاً آدمی نامہ میں آدم ذات کو ان تمام الوہی، روحانی اور فوق الفطری صفات کا مجسمہ دکھایا گیا ہے جو فرشتوں سے منسوب کی جاتی ہیں۔مثلاً:

آدمی آہنگ باروِ نغمہ خواں
آدمی ہے خاک کے منہ میں زباں
دہر کو جن قوتوں پر ناز ہے
سب ہیں گونگی آدمی آواز ہے
آدمی کا ناطقہ وحی مبیں
آدمی کا ذہن، جبریل امیں
درمیان تحت و فوق و بحروبر

بس ہے ایک انسان جنسِ معتبر

ظاہر ہے یہ انسان کی تخلیقی، ذہنی اور عملی صلاحیتوں کا ایک مبالغہ آمیز بیان لگتا ہے اس لیے اسے ثابت کرنے کے لئے جوشؔ نظم کے دوسرے بند میں انسانی تہذیب کی تاریخ سے ایسی برگزیدہ ہستیوں کو پیش کرتے ہیں جنہوں نے تہذیبِ انسانی کی تعمیر و تزئین کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔

اس سلسلے کی دوسری اہم نظم ''زمین کا براق'' ہے۔ جس میں شاعر نے بہت فخر و ناز سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انسان اپنی علم و آگہی، تحقیق و تلاش اور دانشوری سے ساری کائنات کے اسرار و قوانین معلوم کر کے اُس کا حاکم بنتا جا رہا ہے۔ چاند تاروں کو مسخر کر رہا ہے۔ جوشؔ کے یہاں عظمت انسان کا جو تصور ہے وہ ایک پیشین گوئی معلوم ہوتی ہے۔ جس کی حقیقت سے ہر صدی نقاب اُٹھاتی جا رہی ہے۔ انسان ہی ہے جو ارض و سما کی ساری حریف طاقتوں کو زیر کر کے انسانی سربلندی کا پرچم لہرا رہا ہے۔ یہاں تک کہ موت پر فتح پانے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ یہ دو اشعار دیکھئے:

ابھی نہیں نہ سہی کل یہ نعرہ گونجے گا
کہ دہر کا ہے بشر قادرو اعلی الا طلاق
مسیح وقت، پئے قطع حرفِ مرگ اے جوشؔ
اُلٹ رہا ہے کتابِ حیات کے اوراق

عظمت آدم کے بارے میں دو نظمیں ''عروجِ انسانی'' اور ''اے نوعِ بشر جاگ'' بھی اپنی فنی تعمیر اور پیکر تراشی کے لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ''عروجِ انسانی'' صرف انسان کی قوت و قدرت کا رزمیہ نہیں بلکہ اس میں ایک دقیق اور جرأت مندانہ فلسفیانہ پیغام بھی ہے۔ ایسی نظموں کو پڑھ کر کم سواد قاری جوشؔ پر الحاد کا الزام لگاتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ خدا کے وجود کا انکار نہیں کرتے صرف یہ دکھاتے ہیں کہ خدا نے زمین پر جس انسان کو بھیجا تھا اس نے عقل و ذہانت اور اپنی بے کراں تخلیقی قوتوں سے اس دنیا کو کتنا حسین بنا دیا ہے۔ انسان کے لئے عیش و نشاط کے کتنے

سامان پیدا کر دئے ہیں۔ انسان اس زمین پر ایسے مناظر پیدا کرتا ہے جو نابود تھے۔ چاند کے بعد مرّیخ پر پہنچنے کا سامان ہو رہا ہے۔ جوشؔ شاعرانہ اشاریت اور تمثالوں سے بتاتے ہیں کہ خدا اور انسان کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں۔ کوئی کشمکش نہیں۔ جن کارہائے جہاں کی تکمیل کے لئے خدا نے آدم کو زمین پر اُتارا تھا وہ انہیں کاموں کی تکمیل کر رہا ہے۔ اور اب تو سائنس اور ٹکنولاجی کے ذریعے انسان اور دوسری مخلوق بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے شاعر یہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ دن بھی آسکتے ہیں کہ جب عبد اور معبود اپنی تمام لا ثانی توانائیوں کو لے کر ایک رنگ ہو جائیں گے۔ ''نظم اے نوعِ بشر جاگ'' کا آغاز گرد و پیش کے معاشرتی مظاہر پر تنقیدی تبصرے سے ہوتا ہے۔ یہاں وہی شاعر جو انسانی عظمت کا قصیدہ خواں ہے انسانی وجود کے تاریک اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے لیکن ساتھ ہی بیدار ہونے کا پیغام بھی دیتا ہے۔ اس طرح جوش اپنی فکر کو تنقیدی شعور کا تابع کر کے ایک توازن قائم کرتے ہیں۔ جس طرح کائنات اور انسانی وجود کے ارتقاء میں یزداں اور اہرمن کی دو متضاد قوتیں کارفرما رہی ہیں اسی طرح انسان کا خمیر بھی ان متضاد قوتوں کے خمیر سے عبارت ہے۔ مثال کے لئے دو بند پیش ہیں:

آبا کے فسانوں کا تجھے اب بھی ہے سرسام
مبروص تیرا ذہن، تیری عقل زبوں گام
جھولی میں تیری آج بھی اے بستۂ آلام
سیلے ہوئے اقوال ہیں، چکٹے ہوئے اوہام

اے کشتۂ اجداد، پئے نقد ونظر، جاگ
اے نوع بشر، نوع بشر نوع بشر جاگ، اے نوع بشر جاگ

تو جنسِ تعصب کا خریدار ہے اب تک
ملکوں کے گھروندوں میں گرفتار ہے اب تک
دل وحدتِ اقوام سے بیزار ہے اب تک
تو مشرک وخوں خوار وسیہ کار ہے اب تک

انسان کے اے دیدۂ توحید نگر، جاگ
اے نوع بشر، نوع بشر نوع بشر جاگ، اے نوع بشر جاگ

''اکتارا'' جوشؔ کی ایک شاہکار نظم ہے۔ جس میں انسانی عظمت کے نقوش تو ابھرتے ہی ہیں لیکن اس سے زیادہ نظم کی تمثالوں اور علامتوں کے مترنم سائے میں انسان کی وحدت کا تصور بھی سانس لیتا دکھائی دیتا ہے انسانی وحدت جوش کی سماجی فکر کا کعبہ ہے۔ وہ بار بار اس موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ''اکتارا'' جیسی گہری اشاراتی نظموں کے آہنگ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش انسان کو ہر طرح کی جغرافیائی، نسلی اور مذہبی حد بندیوں سے آزاد صرف ایک انسان کی شکل میں دیکھتے تھے اور اس کے اخلاق اور توانائیوں کا یہی نقش اجاگر کرتے تھے ''اکتارا'' نظم کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس کے دامن میں انسان کی وہ تمام سرگرمیاں، جذباتی وابستگیاں اور لاتعداد انسانی رشتے متحرک نظر آتے ہیں جن سے انسان اور انسانیت عبارت ہے خود اپنی ذات کو شاعر نے نظم کا مرکزی نشان بنادیا ہے۔ مثلاً

سب کے کاجل، میرے پارے
سب کی آنکھیں، میرے تارے
سب کی سانسیں، میرے دھارے
سارے انساں، میرے پیارے
ساری دھرتی میرا آنگن
بول اکتارے جھن جھن، جھن جھن

جوش ان سبھی فطری یا غیر فطری دیواروں کو گرا دینے کے حق میں تھے جو اس زمین کے انسانوں کو بانٹ دیتی ہیں۔ اس لئے وہ نہ صرف انسان کی وحدت کے اجزاء وعناصر پر زور دیتے ہیں بلکہ ان اعلیٰ اخلاقی صفات کو بھی شاعرانہ حسن سے سامنے لاتے ہیں جو تمام مہذب انسانوں کی مشترک میراث ہیں۔ جوشؔ وطنیت، قومیت، نسل ورنگ اور دین دھرم کے فرق کو اتحاد واخوت کے عظیم رشتوں میں خلل ڈالنے کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اس لئے پیغام دیتے ہیں:

تفریق جو سکھائے وہ تاریخ پھاڑ دے
جغرافیہ کا محبسِ دیریں اجاڑ دے
نقشوں کی نیش دار لکیریں بگاڑ دے
ایمان اور کفر کو دامن سے جھاڑ دے
للہ، افتراق کا دروازہ بند کر
اُٹھ اور لوائے وحدتِ انساں بلند کر

دنیا کے ہر خطّے میں علم وادب کے سارے ذخیرے قلم کی دین ہیں۔ جوشؔ کے یہاں بھی قلم انسانی عقل وخرد اور تفہیم وتلاش کی علامت ہے۔ دنیا میں تعمیر وترقی اور تعلیم وتدریس کی جو روشنی ہے اور جس کے فیضان سے ایجادات وترقیات نے جنم لیا وہ قلم ہی کا عطیہ ہیں۔ اس حقیقت کو جوشؔ نے ایک محکم عقیدے کی طرح نظم کے پیکر میں سمویا ہے۔ اور اس کے لئے بڑی نادر تشبیہات اور استعارات سے کام لیا ہے۔ نظم ''لافانی حروف'' کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اُنگلیاں، چھلکا چکیں گی جب معانی کے ایاغ
جل اُٹھیں گے، دائروں کے طاق میں لاکھوں چراغ
سرمئی سطروں کی گلیوں میں بہے گی طرفہ نہر
جگمگا اُٹھیں گے ساحل پر خرد افروز شہر
یوں، تجلی نقطوں میں ہوگی، تابِ دُرہائے عدن
شاعروں کی مفلسی، شاہوں پہ ہوگی خندہ زن

''خرد افروز'' کی ترکیب سے شاعر توہمات اور روایتی معلومات کے بجائے جدید سائنسی فروغ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ''موجد ومفکر'' میں بھی اسی فکر کی شاعرانہ توسیع ہے۔ پوری نظم علم وایجادات کے ہاتھوں انسان کی مادّی اور تہذیبی زندگی کا رزمیہ ہے۔ یعنی کس طرح انسان نے ارض وسماء اور اس کے قوانین پر فتح پائی۔ کیسے نئی ایجادات نے نئی سہولتوں اور آسائشوں سے انسان کے دامن کو بھر دیا اور ان سب کے نتیجہ میں کیونکر انسانی تہذیب نئے انقلابات اور فروغ

انسانی کے نئے علاقوں میں داخل ہوئی۔ نظم کے دو بند مثال کے لئے پیش ہیں:

آرزوئے خانہ آرائی کی شمعیں جل اُٹھیں
کسمسا کر ، صنعتِ نوخیز نے آنکھیں ملیں
طفلکِ تعمیر نے ، بیونتی قبائے ماء وَطیں
سر پہ رکھ کر، گنبدوں کے قمقمے ناچی زمیں
سنگ ریزے ناز سے ہمکے، منارے بن گئے
کروٹیں، ذرّوں نے کچھ یوں لیں کہ تارے بن گئے

ذوق نکھرا، کہکشانی بام و در بننے لگے
سنگ ریزے آئینے، قطرے گہر بننے لگے
برق پارے ، مرغ ہائے نامہ بر بننے لگے
آہنی اعصاب، ڈھل کر بال و پر بننے لگے
زندگی، اوجِ ثریاّ کی طرف جانے لگی
قلبِ انجم کے، دھڑکنے کی صدا آنے لگی

آہنی اعصاب سے مراد ''طیارہ'' ہے۔ نظم کے ابواب کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شاعر نے کس طرح سائنس اور صنعت کی ارتقاء کو شاعرانہ لب ولہجہ میں پیش کر دیا ہے۔

نظم ''مرحمتِ بے جا'' میں شاعر کو خدا سے جو شکایت ہے اُس میں گھن گرج نہیں بلکہ ایک طرح کی سپردگی، عقیدت، داخلیت، جذبہ اور یاسیت ہے۔ جوشؔ جب اس قسم کی آسان فہم اور سادہ اسلوب کی نظمیں لکھتے ہیں تو اُن میں حقائق کا پرتو واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے مثلاً زندگی کی ناہمواریوں، تکلیفوں اور اضداد کو دیکھتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

ہم پہ یہ مرحمت نہ کی ہوتی
داورا، زندگی نہ دی ہوتی

اور اگر ناگزیر تھی ہستی
تو حقیقی و سرمدی ہوتی
یا یہ ہوتا کہ گود سے تا گور
زندگی سربسر خوشی ہوتی
ہر خوشی کا مآل اگر غم ہے
غم میں اک گو نہ چاشنی ہوتی
داورا، جو تری مشیّت ہے
طینت آدمی وہی ہوتی
تم رہو گے حریف آپس میں
ہم کو یہ بددعا نہ دی ہوتی
ایک دل تو ہرا بھرا ہوتا
اک دیے میں تو روشنی ہوتی

اس طرح جن نکات اور نظریات سے جوش نے اپنی شاعری کی تعمیر کی ہے ان سے وہ انسان نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے جو زندگی کے ہر میدان میں مصروفِ عمل ہے۔ طبقاتی نظام میں یہ عمل مثبت بھی ہے اور منفی بھی ان انسانوں میں مفسد، مولوی، مصلح، ہادی، رہبر، مفلس اور زردار بھی شامل ہیں۔ جوش کے یہاں انسان کی بے حرمتی کا احساس ہی انسان کی عظمت کا تصور پیدا کرتا ہے اور یہ تصور طنزیہ صورتوں میں جوش کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شاید کچھ لوگ اس سماجی فکر کو کمتر خیال کرتے تھے اسی لئے جوش سے بھی اقبال کی طرح اعلیٰ اور ہمہ گیر فلسفے کی امید کرتے تھے ۔ جو آفاقی ہو، خواہ عملی نہ ہو۔ علامہ اقبال کے یہاں انسان کی عظمت کا جو تصور ہے اُس کا سرچشمہ جرمن فلسفی نطشے کا فلسفہ کہا جاتا ہے ۔ جوش بھی نطشے سے متاثر تھے۔ اسی لئے اُنھوں نے اپنا مجموعہ ''سنبل وسلاسل'' (۱۹۴۷ء) ''امیر فکر و تخیل نطشے اعظم'' کے نام منسوب کیا ہے۔ وہ نطشے کو ایک بڑا مفکر ضرور مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ کارل مارکس کے جدلیاتی اور انسان دوست فلسفہ کو

بھی عزیز رکھتے تھے۔اور صرف ایک مرد کامل کو نہیں ہر انسان کو استحصال سے آزاد ہو کر بلند ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔نطشے مادّہ پرست اور ذات خداوندی کا منکر تھا۔لیکن جوشؔ مذہب کے نام نہاد اجارہ داروں سے برہم و بیزار ہونے کے باوجود شاید خدا کے ایسے منکر نہیں تھے۔سچ تو یہ ہے کہ انسان کی عظمت پر ان کا پختہ عقیدہ ہی انھیں خدا کے قریب لے گیا۔ان کی نظم ''عظمت انسان'' کا یہ بند دیکھئے:

ذہن جس وقت کہ ہو جائے گا انساں آگاہ
تو نکل آئے گا خود پردۂ انساں سے اللہ
وحدت انفس و آفاق کو پالے گی نگاہ
اور شریعت یہ بنے گی کہ تکدّر ہے گناہ
شور ہوگا نہ رہے کوئی وفا کا دشمن
بے شک انسان کا دشمن ہے خدا کا دشمن

☆☆☆

خصوصی گوشہ

جوشؔ اور لکھنؤ

سید محمود الحسن رضوی

شبیر حسن خاں، جو شاعروں کی صف میں جوش ملیح آبادی کی حیثیت سے مشہور ہوئے اُن کی ولادت ۱۸۹۸ء میں ملیح آباد کے اُس قصبے میں ہوئی جو لکھنؤ سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے لیکن اُن کے آباء واجداد کا لکھنؤ سے ایسا گہرا رشتہ رہا ہے کہ جوش کی زندگی کی ہر منزل پر اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ جوش کے پردادا فقیر محمد خاں ریاست ٹونک کی فوج کے اعلیٰ عہدوں پر نہ صرف فائز تھے بلکہ اپنی بہادری اور دانشوری کی وجہ سے وہاں کے نواب میر خاں کو اُن پر غیر معمولی اعتماد تھا۔ انھوں نے بعض مسائل پر تبادلۂ خیال کے لئے اُن کو اودھ میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا اور وہ یہاں کے نواب غازی الدین حیدر سے ملے۔ غازی الدین حیدر اُن سے اتنا متاثر ہوئے کہ کہا: ''خاں صاحب میں آپ کو جانے نہیں دوں گا'' چنانچہ غازی الدین کے وزیر نواب معتمد الدولہ نے والیٔ ٹونک سے اجازت لے کر حکومتِ اودھ سے وابستہ کرلیا۔ اُس وقت فقیر محمد خاں کے والد محمد بلند خاں ملیح آباد ہی میں رہتے تھے۔ وہ اُن سے ملنے کے لئے پورے شاہی شان وشوکت کے ساتھ ملیح آباد گئے اور جب وہاں والد سے ملاقات کرنے کے بعد لکھنؤ واپس آئے تو غازی الدین حیدر نے پچیس ہزار سواروں کا رسالہ دار بنادیا، بعد میں اُنھیں سرکارِ خیر آباد کا گورنر بھی بنادیا گیا۔ فقیر محمد خاں نے لکھنؤ کے گولہ گنج علاقہ میں اپنا محل بنوایا اور ذاتی سپاہیوں اور کارندوں کے لئے بھی مکانات تعمیر کروائے۔ انھوں نے ملیح آباد سے ایک میل کے فاصلے پر میرزا گنج میں سیکڑوں ایکڑ زمین خرید کر وہاں اپنے محل بنوائے، بارہ دری بنوائی۔ آم کے باغ لگوائے اور اُمراء و

رؤساء کے علاوہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہے۔ جوش نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' میں لکھا ہے کہ ''ہر چند وہ آزاد قبائل کے ایک اکھڑ پٹھان تھے، انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کو اِس قدر جذب کر لیا تھا کہ لکھنؤ کے قدیم نوابوں اور اُن کے مابین کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا تھا۔ اُن کے محلوں کی سجاوٹ، اُن کے ماکولات وملبوسات کی نفاست، اُن کی بٹیریں اور مرغوں کی پالیاں، اُن کے مشاعرے، اُن کے شبستاں میں راتوں کے مجرے، اُن کی ادب نوازیاں اور اہلِ علم پر اُن کی زر پاشیاں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے یہ گمان ہوتا کہ وہ اس تہذیب میں ایک نومسلم کی طرح داخل ہوئے ہیں'' اور لکھنوی تہذیب کے یہی عناصر جوش کے دادا اور والد کے بعد جوش کو بھی ورثہ میں ملے۔ اتنا ہی نہیں خود جوش کی والدہ راجپوتانہ کے دھول پور کے جاگیردار کی بیٹی تھیں۔ اُن کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی لکھنؤ کی اُستانی اور لائق اُستاد کو بلایا گیا تھا، یہاں تک کہ اُن کو آداب وتہذیب سکھانے کے لئے لکھنؤ کی مغلانیوں کو ملازم رکھا گیا تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جوش آنکھ کھولنے کے بعد ہوش سنبھالتے ہی اس لکھنوی ماحول سے مانوس ہونے لگے تھے۔ اُن کی انا لکھنؤ کی سیدانیوں میں سے تھیں، لکھنؤ ہی کے داستان گو سید محمد اکبر ''طلسمِ ہوش رُبا'' سُناتے تھے۔ گھر میں مشاعرے کی محفلیں ہوتی رہتی تھیں جن میں لکھنؤ کے ممتاز شعراء صفی، ثاقب، عزیز وغیرہ آکر شرکت کرتے تھے۔ یہ سارا پس منظر تھا جس میں جوش کا شعور بیدار ہوا اور وہ ملیح آباد سے زیادہ لکھنؤ سے قربت رکھنے لگے۔ لکھنؤ علم و فضل، شعر و ادب، فلسفہ وحکمت، موسیقی و صناعی کا مرکز تھا۔ یہاں کا کلچر شرافت، رواداری اور انسانیت کی بنیادوں پر تعمیر ہوا تھا۔ جوش کا باشعور ذہن قدم قدم پر اس سے متاثر ہوتا رہا اور ایک منزل وہ آگئی جب اُن کے لئے لکھنؤ ہی سب کچھ تھا۔

یوں تو جوش سب سے پہلے نُو برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے لیکن یہاں آکر جو نقوش اُن کے دل و دماغ پر قائم ہوئے اُنھیں وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے اور وہ یہاں سے قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ اپنے اس پہلے سفر کے بعد جب وہ ملیح آباد سے ٹرین سے لکھنؤ کے چار باغ اسٹیشن پر اُترے تو ''یادوں کی برات'' میں یہ کیفیات پیش کی ہیں کہ:

''الحفیظ و الاماں! چار باغ کی طوفاں بدوش و قیامت در آغوش ہلچل، گھما گھمی، دھکا پیل، افراتفری، نفسی نفسی، چیخ و پکار، گاؤں گہار، گھبراہٹیں، ریل پیل، شائیں شائیں، غائیں غائیں، دھڑام دھڑام .... پھر اس پر دوڑتے ٹھیلوں کی جگر خراش گھڑ گھڑاہٹیں، قلیوں کی قلی قلی کے نعروں کے ساتھ لنگوری جستیں، خوانچے والوں کا شور و غوغا، ٹکٹ چیکروں .... بچوں کو کاندھے پر بٹھائے بدحواس مسافروں کے مابین دھکم دھکا...... فرنگیوں کے چھچھورے غرور میں ڈھلے ہوئے روکھے پھیکے چنگیزی چہرے اور میموں کے سایۂ شاخِ گل میں پلی ہوئی چھلاسی کمریں....... میں تو دیوانہ ہو گیا......''

اسٹیشن سے باہر آ کر وہ سواریوں پر بیٹھ کر نخاس میں اکبری گیٹ کی طرف جانے لگے۔ اُن کے قیام کا انتظام بانس والی سرائے میں کیا گیا تھا۔ سرائے میں سواریوں سے اُترتے وقت سپاہیوں کی سج دھج، اُن کے خط و خال، قد و قامت، بڑے بڑے پگڑ، موٹے موٹے لٹھ دیکھ کر اربابِ لکھنؤ اُن کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ اُس وقت کے لکھنؤ میں چوک کا علاقہ طوائفوں اور اربابِ نشاط کا مرکز تھا جب جوش سب سے پہلے اُدھر سے گزرے، اپنے تاثرات کو اِس طرح پیش کیا ہے:

''ہار والے کی سُریلی آواز .... ہار بیلے کے پھول چمپا کے ...... ہائے تنبولیوں کی وہ جھلملاتی تتری کلاہیں، وہ دوپلّی ٹوپیاں، وہ شربتی انگرکھے، وہ گھنے گھنے پٹے، وہ چوڑی دار پائجامے، شانوں پر وہ ریشمی بڑے بڑے رومال، آڑی ترچھی مانگیں، کلوں میں دبی ہوئی معطر گلوریاں ساقیوں اور ساقنوں کے ہاتھ میں وہ خوشبودار تمباکو کے حقے، حقوں پر وہ لپٹے ہار، ہاروں سے پانی کے قطروں کا وہ ترشح، وہ بجتے کٹورے، وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے، بالاخانوں کے چھجوں سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی اور زلفوں کے سیاہ آبشار، کوٹھے والیوں

میں کوئی گوری، کوئی چمپئی، کوئی سانولی سلونی، خدوخال اتنے باریک گویا
ہیرے قلم سے ترشے ہوئے .... ہمکتی ہوئی اُٹھان، کوئی گٹھے جسم کی اور
کوئی دھان پان، کسی کی ناک میں نتھ، کسی کی ناک میں نیم کا تنکا،
تماشائیوں کا ہجوم، شانے سے شانے چھیلتے ریلے......"

یہاں اِس طویل اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لکھنؤ پہنچنے کی پہلی منزل پر اُن کے جذبات میں جو ہیجان برپا ہوا تھا وہ اُن کی شاعری میں حسن ورومانیت کی علامت کے طور پر ہمیشہ قائم رہا اور یہی کیفیات تھیں جن کے تحت بعض ناقدین نے اُن کو رومانی اور تاثراتی شاعر بنا کر پیش کیا۔

لکھنؤ کے اِس پہلے سفر میں جوش نے یہاں تقریباً دس دِن قیام کیا اور شہر کی تمام تاریخی عمارتیں، بارونق بازار، پارک اور مذہبی اداروں سے واقفیت حاصل کی لیکن ان سب سے زیادہ وہ یہاں کے رؤساء، علماء، ادباء، شرفاء اور شعراء سے متاثر ہوئے۔ اِس سلسلے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے "یادوں کی برات" میں لکھا ہے کہ:

"اللہ اللہ وہ اُن کے کچیلے سلام، اُن کی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز، وہ اُن کی تہذیب میں ڈوبی وضع قطع، وہ اُن کے لباس کی انوکھی تراش خراش، وہ مسائلِ علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام، اُن کے الفاظ کا ٹھہراؤ، وہ اُن کے لہجوں کے کٹاؤ، اثنائے غزل خوانی میں وہ حسبِ مفہوم شعراء کی آنکھوں کا رنگ، اُن کے چہرے کا وہ اُتار چڑھاؤ، اُن کا ہلکا ہلکا تبسم، وہ اُن کے انکسار کے سانچے میں ڈھلا ہوا وقار، ساری باتیں دیکھ کر میں نقش بہ دیوار ہو کر رہ گیا۔ وہ تمام لوگ اِس قدر شائستہ، شستہ اور گداختہ تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِس کرۂ خاک کے نہیں کسی کرۂ نور کے باشندے ہیں۔"

چنانچہ لڑکپن کی یہ یادیں زندگی کے آخری لمحوں تک حسرت و یاس کی شکل میں قائم رہیں۔ ان کا اظہار اِس طرح کیا ہے کہ "اب وہ لکھنؤ ہے نہ لکھنؤ والے۔ ایک ایک کر کے چلے گئے سب خاک

کے نیچے۔'' لڑکپن ہی کا دور تھا جب انھوں نے لکھنؤ میں فرنگی حکومت کے مظالم دیکھے اور عوام کے دلوں میں اُن سے نفرت و بغاوت کے اُبھرتے ہوئے طوفان کو دیکھا اور یہ سب کچھ جوش کے احساسات، جذبات پر اِس طرح چھا گئے کہ جس کے زیرِ اثر اُن کی شاعری میں انقلاب کے آہنی قدموں کی چاپ سُنائی دینے لگی۔

تعلیم کے سلسلہ میں سب سے پہلے تو اُن کا داخلہ سیتاپور میں کرایا گیا لیکن تقریباً ایک سال کے بعد وہ لکھنؤ کے حسین آباد اسکول میں داخل ہو گئے۔ اُن کے قیام کے لئے نخاس کے چڑیا بازار کے پاس ایک کشادہ مکان کرائے پر لیا گیا تھا۔ اُس وقت لکھنوی آداب و تہذیب کی حیثیت سے یہی علاقہ سب سے اہم مرکز تھا اور اُس دور کے جو تاثرات جوش کے دل و دماغ پر قائم ہوئے تھے اُسے یاد کر کے بعد میں بھی آنسو بہاتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ کے فرنگی محل میں اُنھوں نے سب سے پہلے مشاعرہ میں شرکت کی اور اپنی غزل سُنائی۔ یہ غزل اتنی کامیاب رہی کہ لکھنؤ کے سبھی شعراء نے تعریف کی، خاص کر مرزا محمد ہادی رُسوا بہت متاثر ہوئے چنانچہ اس کے بعد ہی اُن کے والد نے جوش کو لکھنؤ کے ذی علم اور ممتاز اُستاد عزیز لکھنوی کی شاگردی میں دے دیا لیکن جوش کی فکر کا جادہ اُن سے مختلف تھا اور اُستادی اور شاگردی کا یہ سلسلہ پانچ چھ سال کے بعد ختم ہو گیا۔

لکھنؤ کے حسین آباد اسکول میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ کے ایم۔اے۔او میں بھی داخلہ لیا لیکن وہاں سے پھر آ کر کرسچن کالج میں نام لکھایا گیا۔ اِس دوران وہ کبھی لاٹوش روڈ کے مکان میں رہتے تھے، کبھی راجہ ابو جعفر کی کرنسی روڈ کی کوٹھی میں اور کبھی کچھوئے کے علاقہ میں۔ یہیں پر اُن کو مرزا ہادی رسوا سے علمی استفادہ کا موقع بھی ملا۔ یہاں کے علماء اور مرثیہ گویوں کے زیرِ اثر وہ شیعیت کے بھی قریب ہو گئے۔

وہ کچھ دنوں کے لئے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آگرہ میں بھی مقیم رہے لیکن وہاں سے جلد ہی واپس آ کر حیدرآباد چلے گئے جہاں تقریباً دس سال حکومتِ نظام میں ملازم رہے۔ وہاں سے معتوب ہو کر دہلی آ گئے پھر مسز سروجنی نائیڈو کے مشورہ سے ماہنامہ ''کلیم'' نکالنا شروع کیا لیکن اُس میں بھی کامیابی نہیں ملی تو لکھنؤ واپس آ گئے۔ اُس وقت سبط حسن اور علی سردار جعفری

یہاں ''نیا ادب'' نکالتے تھے ''کلیم'' کو اُسی سے ملا دیا گیا اور ''کلیم و نیا ادب'' نام رکھا گیا اور ۱۹۴۱ء سے پھر لکھنؤ ہی میں رہنے لگے۔ حالانکہ اُنھوں نے ملیح آباد میں آم کے باغات بھی لگوائے، جائداد کی دیکھ بھال بھی کرنے لگے تھے لیکن لکھنؤ سے کچھ دور رہ کر بھی اُن کو سکون میسر نہ تھا۔ یہاں آکر اُنھوں نے بنارسی باغ کے پھاٹک کے پاس ایک کوٹھی کرائے پر لی۔ یہیں پر ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' نظم پر اُن کے گھر کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔ کچھ عرصہ تک وہ فلم سے بھی وابستہ رہے، اِس کے بعد دہلی میں ''آجکل'' کے اڈیٹر کی حیثیت سے بھی نام کیا لیکن اگر اُن کی ذہنی وجذباتی وابستگی تھی تو لکھنؤ سے۔ اُنھوں نے اپنی ایک رباعی میں کہا کہ:

جلتی ہوئی شمعوں کو بجھانے والے
جیتا نہیں چھوڑیں گے زمانے والے
لاشِ دہلی پہ لکھنؤ نے یہ کہا
اب ہم بھی ہیں کچھ روز میں آنے والے

دراصل جب جوش ملیح آباد میں رہتے تھے اُس زمانے میں بھی تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن لکھنؤ آتے رہتے تھے اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہیں پر اُن کی ساری دلچسپیاں تھیں۔ بے تکلف دوستوں کی محفلیں، شعراء کے حلقے، بزرگوں اور اساتذہ کے علمی وادبی مسائل کے مباحث، ہر چیز کا مرکز یہیں ملتا۔ پروفیسر احتشام حسین نے جوش کی لکھنؤ کی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

'' کچھ دنوں بعد جوش نے لکھنؤ ہی میں مستقل قیام اختیار کیا....... ادبی جلسوں اور صحبتوں میں شریک ہوتے، رندانہ محفلوں میں بھی۔ عزیزوں اور دوستوں کے یہاں بھی جاتے اور شہر سے باہر بھی۔ شام ہوتے ہی پیمانہ بکف طلوع ہو جاتے۔ مختلف مقامات پر نشستیں ہوتیں، وہاں مخصوص احباب ہوتے۔ کبھی شعر و شاعری میں، کبھی باتوں میں وقت کٹتا۔ اِن صحبتوں میں زیادہ تر جوش کے پرستار ہوتے جو کبھی کبھی اُمراء کے دربار کی

کیفیت پیدا کر دیتے ۔ گفتگو، اندازِ گفتگو، لطائف وظرائف، نشست و
برخاست کی یکسانیت کبھی کبھی ان لوگوں کو اُکتا بھی دیتی تھی جو محفل میں
شریک ہوکر باہوش تماشائی بھی بن سکتے تھے۔''

اُن کی شخصیت میں ایسا وقار اور علمیت میں ایسی بلندی محسوس ہوتی تھی کہ وہ نوجوان نسل کے ادیبوں اور شاعروں میں اتنا ہی مقبول تھے جتنا بزرگوں میں ۔ علماء اور مجتہدین بھی اُن کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے قائل تھے اور آزاد خیال علم دوست افراد بھی ۔ ترقی پسند شاعروں اور فن کاروں کے رہنما بھی مانے جاتے تھے ۔ قدیم اور روایتی شعر و ادب کے پرستار بھی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ سجاد ظہیر، سردار جعفری اور مجاز وغیرہ سے بھی اُتنا ہی قریب تھے جتنا جعفر علی خاں اثر، ثاقب وغیرہ سے ۔ وہ علمائے فرنگی محل سے بھی علمی استفادہ کرتے تھے اور شیعہ عالموں سے بھی مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے ۔ یہاں انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ ''حسین وانقلاب'' بھی سُنایا اور قومی وانقلابی تصورات سے متعلق نظمیں بھی کہیں ۔ لکھنؤ میں اُن کے قریبی دوستوں میں حکیم صاحبِ عالم، مرزا جعفر حسین، رفیع احمد خاں، مجاز، علی عباس حسینی، اختر علی تلہری، مانی جائسی، شرر لکھنوی، اثر لکھنوی اور نہ معلوم کیسے کیسے لوگ تھے ۔ ملیح آباد سے لکھنؤ جب مختصر قیام کے لئے آتے تو عام طور سے امین آباد کے سنٹرل ہوٹل میں قیام کرتے ۔ شام کو زیادہ تر گولہ گنج میں مرزا جعفر حسین کے یہاں ناؤ ناش اور شعر و شاعری کی محفل جمتی ۔ قریب ہی احتشام حسین صاحب بھی رہتے تھے ۔ اکثر وہ بھی اِن محفلوں میں آکر ادبی و علمی مسائل میں حصہ لیتے تھے لیکن ناؤ نوش سے دور رہتے ۔ جوش احتشام صاحب کی علمی و تنقیدی بصیرت کے شدت سے معترف تھے ۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ جوش گرمیوں کی دوپہر میں اپنی کار پر سید احتشام صاحب کے گھر آئے، راقم الحروف بھی وہاں موجود تھا ۔ احتشام صاحب سو رہے تھے، جگائے گئے ۔ جوش اندر کمرے میں نہیں آئے اور احتشام صاحب سے کہا کہ کئی دنوں سے میرے ذہن میں یہ خلش اور کشمکش ہے کہ آخر اقبال کی شاعری میں وہ کون سے عناصر ہیں جو میری شاعری میں نہیں ہیں ۔ میں اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں ۔ احتشام صاحب نے کہا کہ جوش صاحب یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر کافی

غور و فکر کی ضرورت ہے۔ سرسری طور پر تو اِسے حل نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے کہا اچھا میں سنٹرل ہوٹل میں قیام کروں گا وہاں آپ شام کو روز آنہ آیئے اور تمام مباحث سامنے آئیں گے چنانچہ احتشام صاحب روز آنہ وہاں جاتے رہے اور جوش اُن کے مشوروں سے استفادہ کرتے رہے۔

۱۹۵۵ء کے بعد جب جوش پاکستان چلے گئے تو وہاں جو اذیت ناک زندگی بسر کرنی پڑی اُس وقت صرف لکھنؤ کی یادیں اُن کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے انتقال کی خبر سُنی تو اِس طرح بے چین ہو گئے "قلزم انسانیت کے منارہ ضوبار......تہذیب لکھنؤ کے طاقِ زریں.."

"اُن کی موت ایک فرد کی موت نہیں، ایک پوری صدی، ایک پورے طرزِ معاشرت کی موت ہے۔ لکھنؤ کے اولیائے علم و ائمۂ ادب نے شائستگی، تہذیب، نفاست، لطافت اور ادب کی نجابت کا جو دستور قائم کیا تھا، اُنھوں نے جس وضع داری، ایثار پسندی، تواضع شعاری، بزم گفتاری، شیریں لہجگی کو فروغ بخشا تھا اُس کا بھی جنازہ نکل گیا:

سنسان مثلِ وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ آتش آج وطن سے نکل گیا

اس طرح کی یادیں ہی جوش کا سب سے بڑا سرمایہ تھیں، زندگی کے آخری دنوں اور تنہائی کی بے بسی میں وہ سوچتے ہیں کہ:

"ماضی کے سوا میرے پاس اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔ پہلے یادش بخیر بوتل کھلتے ہی طبلے پر تھاپ پڑتی تھی، نازنینوں کی پائلیں جھنک اُٹھتی تھیں اور یارانِ سرمست کے لطیفوں سے محفل گونجنے لگتی تھی۔ اب طبلے کی تھاپ کی جگہ مسامات سے اُٹھتی بھاپ ہے، پائلوں کی جھنک کے عوض سینے میں بربادی کی کھنک ہے اور یاروں کے لطیفوں کے بدلے حالات کے کثیفے ہیں۔"

پاکستان میں قیام کے بعد جب ایک بار وہ لکھنؤ آئے تو ماضی کے گذرے ہوئے رنگین دور، پُرانی عظمتیں اور بچھڑے ہوئے احباب ایک ایک کرکے اُن کے ذہن کے پردوں میں اِس طرح اُبھرتے رہے کہ اُنھیں اپنے جذبات کو قابو میں کرنا مشکل ہوگیا۔ اِن تاثرات کو ''یادوں کی برات'' میں اِس طرح پیش کیا ہے:

> ''سہ پہر تک نخاس گیا، نخاس کی وہ سڑک جو لکھنوی تہذیب کا گہوارہ تھی اُداس اُداس نظر آئی، جیسے دل پر کسی نے گھونسا مار دیا۔ ایک ایک کرکے وہ تمام یارانِ جشن آنکھوں سے گذرنے لگے جنھوں نے وہاں میرے ساتھ راتیں جگائیں اور دھومیں مچائی تھیں اور دیکھا کہ یگانہ چنگیزی، حکیم صاحبِ عالم، مجاز، حکیم مخمور اور عطا حسین قزلباش کفن اوڑھے زینے سے اُترتے چلے آرہے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو آگئے، پُرانی یادیں سر پیٹنے لگیں اور جب چوک میں قدم رکھا تو کلیجہ تھام کر رہ گیا۔''

لکھنؤ سے دور رہ کر اُنھوں نے کبھی یہ کہا تھا کہ:

ہم نشیں مُرغانِ دہلی کی نوا سنجی پہ جھوم
لکھنؤ کے طوطیِ شکر فشاں کو بھول جا

اور لکھنؤ سے بچھڑ کر یہ حالت تھی کہ:

پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لئے

اور اِنھیں یادوں کی ٹیس آخری لمحات تک اُن کو تڑپاتی رہی اور ہجرت کی ناگفتہ بہ کیفیات تھیں جن سے نکلنا اُن کے بس میں نہ تھا، رہ گئی تھیں صرف ملیح آباد اور لکھنؤ کی یادیں جو آخری سانس تک اُن کا ساتھ دیتی رہیں۔

جوشؔ اور حیدرآباد

سید داؤد اشرف

جوش ملیح آبادی کی دارالترجمہ میں ملازمت

جوش ملیح آبادی اردو کے بہت بڑے اور اپنے عہد کے نمائندہ شاعر ہیں۔ حیدرآباد سے ان کا بڑا قریبی تعلق اور گہرا لگاؤ رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد ہی نے جوش کو جبکہ وہ ایک جواں سال ابھرتے ہوئے شاعر تھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اور اسی سرزمین پر ان کی شاعری نے شباب کی منزلیں طے کی تھیں۔ حیدرآباد نے جوش کی سرپرستی بھی کی تھی۔ ان کے ناز اٹھائے تھے اور ان پر عتاب بھی یہیں پر نازل ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ ریاست بدر کر دیئے گئے تھے۔ جوش نے حیدرآباد میں اپنی عمر عزیز کے لگ بھگ دس سال گذارے تھے۔ اور حیدرآباد کے اس شہرۂ آفاق دارالترجمہ میں انھوں نے (۹) سال (۷) ماہ تک ذمہ دارانہ خدمات انجام دی تھیں جو ملک میں پہلی بار ایک ہندوستانی زبان اردو کو اعلیٰ ترین جامعاتی سطح پر ذریعہ تعلیم بنانے کے بعد ترجمہ اور اصطلاحات کی ٹکسال کی حیثیت سے وجود میں آیا تھا لیکن حیدرآباد میں جوش کی اس ملازمت کے بارے میں جو کچھ بھی شایع ہوا ہے وہ نہایت کم ہے اور اس سے برائے نام معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کسی نے جوشؔ کی حیدرآباد کی ملازمت کے بارے میں یہ نہیں لکھا ہے کہ وہ کس تاریخ کو دارالترجمہ میں مترجم کی حیثیت سے رجوع ہوئے تھے، کتنی مدت تک وہ اس عہدہ پر کام کرتے رہے، ناظر ادبی کے عہدہ پر کب ترقی ملی، ان کی مدت ملازمت ٹھیک کتنی تھی، اور کس تاریخ کو عتاب شاہی کے باعث انھوں نے حیدرآباد چھوڑا تھا اس تعلق سے جو بھی معلومات ملتی ہیں ان کا

ماخذ جوشؔ کی خودنوشت سوانح حیات ''یادوں کی برات'' ہے۔آندھیراپردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں اس تعلق سے کافی مواد موجود ہے۔اس مواد کی چھان بین اور تحقیق کے بعد میں جوش کی کہی ہوئی باتوں کی توضیح،تردیداور دیگر حقائق پر سے پردہ ہٹانے کے موقف میں ہوں۔

جوشؔ کی حیدرآباد کی ملازمت کے بارے لکھنے سے قبل انکے حیدرآباد آنے کے اسباب اور یہاں حصولِ ملازمت کے لئے ابتدائی کوششوں کو پس منظر کے طور پر بیان کرنا ضروری ہے۔ اس تعلق سے جوشؔ اپنی سوانح حیات میں ۱۹۲۲ء کے ایک خواب کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس خواب میں حضورِ اکرمؐ نے نظام دکن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جوش سے ارشادفرمایا تھا کہ تم کودس برس تک انکے زیرسایہ رہنا ہے۔اس خواب کی تفصیلات سن کرحیدرآباد جانے کے لئے بیگم جوشؔ مُصر ہوگئی تھیں جوش مزید لکھتے ہیں کہ دکن کا سفران کے لئے خالی ایک معاشی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ انکی ایک رومانی گتھی بھی ایسی تھی جوحیدرآباد گئے بغیر کھُل نہیں سکتی تھی۔ابتدا میں جوش کو یہ اندیشہ تھا کہ یونیورسٹی کی کوئی اعلیٰ ڈگری ان کے پاس نہ ہونے کی وجہ سے حیدرآباد میں انھیں کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی۔ایک اور اندیشہ یہ بھی تھا کہ شاید انکا مزاج ملازمت کی ذلتیں برداشت نہیں کرسکے گا۔ چنانچہ کئی احباب اوراقرباً نے بھی اسی بناء پرانھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ حیدرآباد جانے کے ارادہ کوترک کردیں لیکن جوش نے حالات کے تقاضوں اور بیوی کے اصرار پرسفر حیدرآباد کے لئے اپنے آپ کو تیار کرلیا اوروہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام علامہ اقبال مولانا عبدالماجد دریا آبادی، اکبرالہ آبادی اور مولا سلیمان ندوی کے سفارشی خطوط لے کر ۱۹۲۴ء کے اوائیل میں حیدرآباد پہونچے۔ حیدرآباد میں جب جوش مہاراجہ سرکشن پرشاد سے ملے تو مہاراجہ نے کہا کہ وہ نظام سابع کے معتوب ہوچکے ہیں۔اوراگر جوش ان کے معتوب ہونے سے پہلے حیدرآباد آتے تو پہلے ہی روز ان کا انتظام ہو جاتا۔تاہم مہاراجہ نے تین صفحات پر مشتمل ایک سفارشی خط فینانس منسٹر سراکبر حیدرآبادی کے نام لکھ کر جوش کے حوالہ کیا اوراسی وقت فون پر حیدری صاحب سے اس سلسلہ میں بات بھی کی۔ مہاراجہ کی ہدایت کے مطابق جوش سرراس مسعود کے ساتھ حیدری صاحب سے ملے لیکن دوسری ملاقات میں جب حیدری صاحب نے

انھیں انگریزی حکومت سے سر کا خطاب ملنے پر جوش سے تہنیتی قطعہ کہنے کی فرمائش کی تو جوش کے باغیانہ مزاج کو یہ بات گوارنہ ہوئی جوش نے اس فرمائش کے جواب میں اپنے ردِعمل کا اظہار ایک نہایت سخت جملہ سے کیا اور اہم وسیلہ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جب یہ واقع مہدی یار جنگ کو معلوم ہوا تو ہو جوش کو اپنے والد محترم عمادالملک کے پاس لے کر گئے اور جوش کا تعارف کروانے کے بعد ان سے کلام سنانے کی فرمائش کی جس پر جوش نے اپنے ایک مسدّس کے چند بند سنائے۔ عمادالملک جوش کے کلام کی روانی اور معانی سے متاثر ہوئے اورنہوں نے فوراً پورے ایک صفحہ کا خط جوش کے بارے میں لکھ دیا اور مہدی یار جنگ سے کہا کہ یہ خط سرامین جنگ کے حوالہ کر کے کہنا کہ نظام سابع کے روبرو پیش کریں۔

جوش کے بارے میں جو پہلا فرمان مورخہ ۲۸ رشوال ۱۳۴۳ھ م ۲ رجون ۱۹۲۴ء آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں دستیاب ہے ہو عمادالملک کے سفارشی معروضہ پر جاری ہوا تھا چونکہ عمادالملک نے اپنے سفارشی معروضہ میں صرف جوش کی شاعری کی خصوصیات اور خوبیاں بیان کی تھیں اور ان کے تقرر کے لئے کسی مخصوص جائیداد کی نشاندہی نہیں کی تھی اس لیے اس افسرمان میں جوش کا عندیہ دریافت کیا گیا تھا اس کے علاوہ یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ جوش کو عثمانیہ یونیورسٹی میں کوئی جگہ مل سکتی ہے جوش کے سفارش کے سلسلہ میں عمادالملک نے جو معروضہ آصف سابع کی خدمت میں روانہ کیا تھا وہ اسٹیٹ آرکائیوز کی ایک مثل (File) میں موجود ہے جوش کو اپنی خاندانی برتری اور وجاہت کا بڑا احساس تھا۔ ان کی خودنوشت سوانح حیات ''یادوں کی برات'' اس بات کی گواہی میں پیش کی جاسکتی ہے جس میں وہ جگہ جگہ اپنے نامور بزرگوں کا بڑے ہی فخریہ انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ اس کتاب میں جوش لکھتے ہیں کہ نظام سابع سے جب وہ پہلی بار باریاب ہوئے تھے تو نذر پیش کرنے کے بعد نظام سابع نے حاضرین سے جوش کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔ ''عمادالملک نے لکھا ہے کہ یہ فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں۔'' لیکن اصل معروضہ میں ایسا کوئی جملہ موجود نہیں ہے۔

اکبر حیدری سے دوسری ملاقات کے بعد جوش یہ سمجھنے لگے تھے کہ نہ صرف اکبر حیدری

اور راس سعود ان کے مخالف ہو گئے تھے بلکہ ان حضرات کے طرف دراور پرستار بھی ان کے بدخواہ ہو گئے تھے۔ ان کا یہ گمان صحیح بھی ہوسکتا ہے لیکن متذکرہ بالا مثل میں عماد الملک کے معروضہ کے علاوہ انگریزی میں اکبر حیدری کا سفارشی خط سرامین جنگ معتمد پیشی آصف سابع کے نام موجود ہے اور فرمان مورخہ ۲۸ رشوال ۱۳۴۲ھ میں بھی اس خط کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

جوش لکھتے ہیں کہ پہلی دفعہ باریاب ہونے کے ایک ہفتہ بعد عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ نے انھیں مطلع کیا تھا کہ ناظم سابع نے پولٹیکل اکاڈ کے مترجم کی حیثت سے ان کا تقرر کر دیا ہے۔ اس بارے میں کچھ دیر بات چیت کے بعد جوش نے فرمان کے حاشیہ پر یہ لکھدیا کہ پولٹیکل اکانمی چونکہ ان کا مضمون نہیں رہا ہے اس لئے وہ یہ کام بہتر طور پر نہیں کر سکتے البتہ انگریزی ادب کے ترجمہ کا کام ان کے سپرد کیا جائے تو وہ یہ کام بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے جوش کی اس تحریر کے نیچے عنایت اللہ صاحب نے ناظم شعبہ ہونے کی حیثت سے یہ نوٹ لکھ دیا کہ انگریزی ادب باراہ راست پڑھایا جاتا ہے اس لئے اس کا ترجمہ ایک فعل عبث ہوگا۔ اسٹیٹ آرکائیوز کے ریکارڈ کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ جوش کا پولٹیکل اکانمی کے مترجم کی حیثیت سے بہ ذریعہ فرمان تقرر نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس خدمت پر ان کے تقرر کے لئے عرضداشت پیش کرنے کے لئے فرمان صادر ہوا تھا اس بارے میں تفصیلات ذیل میں درج کی جارہی ہیں۔

دارالترجمہ کی جائیداد مترجمی معاشیات مواجی (۲۵۰) تا (۴۰۰) پر مسٹر کیقباد پستن جی مددگار نظامت کوتوالی اضلاع شاخ پائیگاہ کے تقرر کے لئے عرضداشت مورخہ ۴ رصفر ۱۳۴۳ھ صیغہ عدالت عثمانیہ یونیورسٹی کی جانب سے آصف سابع کی خدمت میں پیش کی گئی تھی جس پر فرمان مورخہ ۷ رصفر ۱۳۴۳ھ م ۷ ستمبر ر ۱۹۲۴ء کے ذریعہ حکم صادر ہوا کہ ''ایک محکمہ کے شخص کو ہٹا کر دوسرے محکمہ میں اس سے کام لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہیں اس خدمت پر جوش ملیح آبادی کا تقرر کیا جاتا جس کے متعلق میں نے استفسار کیا ہے۔'' اس فرمان کی تعمیل میں عرضداشت مورخہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۴۳ء م ۱۰ رنومبر ۱۹۲۴ء کے ذریعہ یہ کیفیت پیش کی گئی۔ ''ناظم دارالترجمہ نے عرض کیا ہے کہ شبیر حسن خاں جوش کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ پولٹیکل اکانمی (معاشیات) جس

کی انگریزی کتابوں کو اردو ترجمہ کرنے کے لئے مسٹر کیقباد پستن جی منشی کا نام مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ نے منظور کیا تھا وہ شبیر حسین جوش کا مضمون نہیں ہے یعنی وہ معاشیات کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ اردو میں نہیں کر سکتے ۔ نیز جوش ملیح آبادی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز انگلش لٹریچر کی کتابوں کے وہ کسی اور مضمون کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ نہیں کر سکتے ۔ انگلش لٹریچر کی کتابیں دارالترجمہ میں ترجمہ نہیں ہوتیں کیونکہ یہ مضمون اپنی اصلی صورت میں جامعہ عثمانیہ میں طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے۔"

جوش آگے لکھتے ہیں کہ چار پانچ روز کے بعد عنایت اللہ صاحب ہی کے ذریعہ انھیں اطلاع ملی کہ نظام سابع نے انگریزی ادب کے مترجم کی حیثیت سے انکا تقرر کر دیا ہے۔ اس بارے میں جوش نے لکھا ہے کہ فرمان میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہر چند اس نئے عہدہ کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہے لیکن سر دست جوش ملیح آبادی کا مترجم انگریزی ادب کے عہدے پر فوراً تقرر کیا جائے اور جب ان کو ترقی مل جائے تو اس عہدہ کو توڑ دیا جائے۔ اسٹیٹ آرکائیوز میں دستیاب اصل فرمان مورخہ ۲۸ / جمادی الاول ۱۳۴۳ھ م ۲۶ / ڈسمبر ۱۹۲۴ء کی تحریر یہ ہے "جوش ملیح آبادی کو انگلش لٹریچر کے کتب کا ترجمہ کرنے کے لئے امتحاناً دو سال کے لئے ڈھائی سو روپے ماہوار کی جگہ دی جائے۔ مگر پہلے ان سے استمزاج کیا جائے کہ آیا وہ اس آفر کو منظور کرتے ہیں یا نہیں۔ اور ان سے یہ بھی کہ دیا جائے کہ اگر یہ ان کو منظور نہیں تو اسے بڑھ کر ان کے حق میں کچھ نہیں ہوسکتا۔ کاروائی داخل دفتر کر دی جائے گی۔"

اسٹیٹ آرکائیوز کے ریکارڈ کے مابق جوش نے یہ خدمت سے علحدہ ہوئے قبول کرلی اور اس جائیداد پر تقرر کے لئے تین اشخاص (۱) آغا محمد حسین (۲) شبیر حسین خان جوش اور (۳) محمد علی شاہ نے درخواستیں دی تھی۔ ناظم دارالترجمہ نے اوپر کے پہلے دو ناموں کے علاوہ دارالترجمہ کے دوارا کین مرزا ہادی رسوا اور عبداللہ عمادی کے ناموں کی بھی پر زور سفارش کی تھی لیکن معتمد عدالت کوتوالی وامور عامہ نواب اکبر یار جنگ نے ان تمام امیدواروں میں سے جوش کی پر زور سفارش کرتے ہوئے یہ لکھ تھا کہ اس خدمت پر جوش کے تقرر سے سرکاری بچت بھی ہوگی۔ یعنی ان

کی موجودہ جائیداد تخفیف کردی جاسکتی ہے۔ اراکین مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ، نظامت جنگ بہادر، حیدر نواز جنگ بہادر، ضیاء یار جنگ بہادر، مرزا یار جنگ بہادر، مسعود جنگ بہادر اور محمد عبدالرحمٰن خاں صدر کلیہ نے اکبر یار جنگ کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ جس پر فرمان مورخہ غرہ ۶ ر ربیع الاول ۱۳۴۵ھ جاری ہوا۔ اس فرمان کے ذریعہ دارالترجمہ کے ناظر ادبی کی جائیداد او پر ایک سال کے لئے امتحاناً جوش کا تقرر بماہوار (۵۰۰) روپے کیا گیا۔ اور انکی مترجمی کی جائیداد تخفیف کردی گئی۔ انھوں نے ۶ ر ربیع الاول ۱۳۴۵ھ ف/ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۶ء کو اس خدمت کا جائزہ لیا۔ ان کی مدّت ملازمت ختم ہوئے پر اس خدمت پر توسیع کے لئے فرامین جاری ہوئے یہاں تک کہ وہ نظام سابع کے معتوب ہوئے اور انھیں ریاست چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ حیدر آباد سے وہ ۱۷ ر جمادی الاول ۱۳۵۲ھ/ ۲۳ مہر ۱۳۴۳ف/ ۲۸ ر اگست ۱۹۳۴ کو واپس ہوئے اور اس تاریخ تک دارالترجمہ میں انکی مدّت ملازمت (۹) سال (۷) ماہ چوبیس یوم ہوتی ہے۔

جوش ملیح آبادی کا ریاست حیدر آباد سے اخراج

سرزمین حیدر آباد نے برصغیر کے کتنے ہی رتن اپنے دامن میں سمیٹے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ان میں ادیب، شاعر، دانشور، اساتذہ، نظم ونسق کے ماہرین، ڈاکٹر، انجینیر، سائینسدان اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں گرانقدر کارنامے انجام دینے والے بھی شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر حیدر آباد دکن ہی کے ہوکر رہ گئے کچھ رتن ایسے بھی ہوں گے جو حیدر آباد سے واپس ہوئے لیکن اس کے دیگر اسباب تھے۔ دیگر مجبوریاں یا ترغیبات تھیں لیکن اردو کے بلند مرتبت شاعر جوش ملیح آبادی کی مثال سب سے مختلف ہے۔ حیدر آباد دکن، اسکی تہذیب اور اس کی فضاؤں سے ان کی چاہت بے پناہ محبت کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ ان کی شاعری اور دیگر تحریروں میں اس کی متعدد شہادتیں ملتی ہیں۔ حیدر آباد سے گہرے لگاؤ کے باوجود جوش کے لئے حالات ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ انھیں ریاست بدر ہوکر حیدر آباد سے نکلنا پڑا تھا۔ حیدر آباد سے ان کے اخراج کے حقیقی اسباب کیا تھے اس تعلق سے اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے یا خود جوش نے لکھا ہے اس سے ساری گرہیں نہیں

کھلتیں اور یہ مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔

جوش نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' میں حیدر آباد سے اخراج کے سلسلہ میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے آصف سابع کے چند فرامین اور احکام کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس مضمون میں ان حوالوں کا آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ اصل ریکارڈ کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے تاکہ مستند ریکارڈ کی بنیاد پر جوش کے اخراج کے اصل واقعات اور اہم امور پر سے پڑے ہوئے دبیز پردے ہٹائے جاسکیں۔ جوش نے ''یادوں کی برات'' میں اپنے اخراج کا اصل سبب بیان کرتے ہوئے اس کی تفصیلات یوں بیان کی ہیں کہ جس روز انھوں نے اپنی نظم ''غلط بخشی'' جاگیرداروں اور وزیروں کے اجتماع میں سنائی اس کے دوسرے ہی روز یہ نظم سابع تک پہنچ گئی کیونکہ اس اجتماع میں خفیہ پولیس کے لوگ بھی موجود تھے۔ نظام سابع نے اس نظم پر اپنا کوئی سخت ردِعمل ظاہر کرنے کے بجائے بڑے خفیہ انداز میں آغا جانی، نائب کوتوال کو جوش کے پاس بھیجا۔ جنھوں نے جوش سے کہا کہ نظام سابع نے فرمایا ہے کہ اگر جوش نظام سابع سے معافی طلب کر کے اس بات کا عہد کرلیں کہ آئندہ ان کے خلاف کچھ نہیں کہیں گے تو نظام سابع تہہ دل سے انھیں معاف کردیں گے۔ آغا جانی نے جوش کو نظام سابع کے پاس چلنے کے لئے اصرار کے ساتھ کہا لیکن جوش نے کہہ دیا کہ وہ معافی مانگنے کو تیار نہیں ہیں۔ بیگم جوش کے سخت اصرار کے باوجود جوش ٹس سے مس نہیں ہوئے اور پھر انھوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔ نظام سابع کی خدمت میں جب یہ استعفیٰ پیش ہوا تو نظام سابع کے غصہ کو بھانپ کر ان کے معتمد پیشی نے جوش کا استعفیٰ پھاڑ کر پرزے پرزے کردیا اور اُسی وقت نظام سابع نے فرمان لکھوایا کہ جوش ملیح آبادی کو ممالک محروسہ سے خارج کیا جاتا ہے۔ وہ پندرہ دن کے اندر اندر روانہ ہو جائیں اور تا حکم ثانی یہاں قدم نہ رکھیں۔ یہ فرمان لیکر آغا جانی جوش کے پاس گئے، جوش کو فرمان بتا کر کہا کہ ''سرکار'' کسی پر عتاب فرماتے ہیں تو اسے چوبیس گھنٹے کے اندر نکال دیتے ہیں مگر آپکو چوبیس گھنٹے کے بجائے پورے پندرہ دن کی مہلت دی گئی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ صورت حال کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیکر معافی مانگ لیں اور یہ فرمان واپس لے لیا جائے اور اس میں حکم ثانی

لکھکر آپکی واپسی کو ناممکن نہیں بنایا گیا ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ چل کر سرکار سے معافی مانگ لیں تو یہ فرمان یقیناً منسوخ کر دیا جائے گا۔

متذکرہ بالا فرمان جاری ہونے سے قبل آغا جانی نائب کوتوال نے نظام سابع کا جو زبانی پیام جوش تک پہونچایا تھا اس کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر فرمان کے جن دونکات کی آغا جانی نے وضاحت کی تھی اس پر کسی قسم کے تبصرے کے بجائے آرکائیوز میں محفوظ اصل احکام مورخہ ۲ر جمادی الاول ۱۳۵۳ھ کی تحریر کو درج کرنا بہتر ہوگا۔

''اس شخص کو اگرچہ بیشتر متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے اعمال کو درست کرے ورنہ اس کی علیحدگی عمل میں آئے گی مگر افسوس ہے کہ اس کا کچھ نتیجہ اچھا نہیں نکلا بلکہ سابقہ حالات ایک حد تک ابھی باقی ہیں، لہٰذا مناسب ہوگا کہ جس مدت کے لئے وہ یہاں ملازم تھا اس حساب سے کچھ ماہوار بطور رعایت اس کے نام جاری کر کے (جس کی مقدار سے پہلے اطلاع دیجائے) اس کو کہہ دیا جائے کہ وہ دو ہفتوں میں یہاں سے خاموشی سے وطن چلا جائے اور بغیر اجازت پھر یہاں آنے کا قصد نہ کرے۔''

جوش لکھتے ہیں کہ وہ حیدرآباد چھوڑنا طئے کر چکے تھے مگر اپنے افراد خاندان عزیز و اقارب اور نوکروں کو ساتھ لے جانے کے لئے ان کے پاس درکار رقم موجود نہیں تھی۔ ابتدائی دس گیارہ روز یونہی سوچ و بچار میں گذر گئے اور پیسوں کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ بالآخر اپنے دوست حکیم آزاد انصاری کے مشورہ پر قرض کی درخواست کے لئے سر اکبر حیدری کے پاس گئے جنھوں نے قرض منظور کر دیا اور جوش کو دوسرے ہی روز پانچ ہزار روپے مل گئے۔ جوش کے اس بیان کی سرکاری ریکارڈ کی روشنی میں توثیق ضرور ہوتی ہے لیکن رقم کی مقدار کے بارے میں جوش نے غلط بیانی سے کام لیا ہے انھوں نے غالباً اپنی آن بان اور مقام و مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لئے یہ بیان کیا کہ انھیں پانچ ہزار روپے بطور قرض ادا کئے گئے تھے جبکہ محکمہ تعلیمات کی عرضداشت مورخہ ۲۸ر شعبان ۱۳۵۳ھ م ۶ر دسمبر ۱۹۳۴ء کی رو سے جوش کو حیدرآباد سے روانگی کے وقت صرف ایک ہزار روپے کلدار بطور مبادلہ دیے گئے تھے۔

جوش اس سلسلہ میں مزید لکھتے ہیں کہ ان کی حیدرآباد سے روانگی کے موقع پر نواب ذوالقدر جنگ نظام سابع کا جو فرمان لے کر ریلوے اسٹیشن آئے تھے وہ فرمان انھیں حرف بہ حرف یاد نہیں رہا لیکن اس کا مفہوم یہ تھا ''جوش ملیح آبادی آج ہندوستان جارہے ہیں ان سے کہدو کہ ہندوستان جاکر اپنے قلم کو ہمارے خلاف استعمال نہ کریں اور اگر معافی پر تیار ہوں تو ہنوز گنجائش باقی ہے۔'' مگر جوش ان احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے حیدرآباد سے روانہ ہوگئے۔ جوش کا یہ بیان سرکاری ریکارڈ کی روشنی میں سراسر غلط ہے اور انھوں نے حسب عادت اپنی بڑہانکی ہے چنانچہ آصف سابع کے اصل احکام مورخہ ۱۶؍جمادی الاول ۱۳۵۳ھ م ۲۷؍اگست ۱۹۳۴ء میں معافی مانگنے کے لئے نہیں کہا گیا ہے اور اس کا لہجہ بھی کافی درشت ہے۔ احکام کی حسب ذیل تحریر سے قارئین خود اندازہ کرسکتے ہیں:

> ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ جوش ملیح آبادی کل یوم سہ شنبہ یہاں سے اپنے وطن چلا جارہا ہے (جس کو حال میں خدمت سے وظیفہ پر علیحدہ کیا گیا تھا) پس اس کو بتوسط صیغہ متعلقہ حکم سنایا جائے کہ جو کچھ وظیفہ (از روئے سروس) اس کو ملے گا تو وہ اس شرط پر کہ وہ بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی خاموشی سے زندگی بسر کرے یعنی وہاں رہ کر اگر یہ پھر اپنے خبث باطن کا اظہار کرے گا (جیسا کہ اس کی عادت رہی ہے) تو بعد تصدیق یہ وظیفہ بھی پاداشاً مسدود ہوجائے گا وہ بس۔''

جوش کی بیان کردہ تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں دارالترجمہ کی ملازمت سے ہاتھ دھونا حیدرآباد چھوڑنا اور غیر یقینی مستقبل کی تاریک راہوں میں بھٹکنا گوارا تھا لیکن معافی مانگنا ہرگز گوارا نہ تھا۔ انھوں نے زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ انھیں معافی مانگنے کے لئے مختلف طریقوں سے کہا گیا مگر وہ اپنی انا اور خودداری کو ٹھیس پہونچاتے ہوئے معافی مانگنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انھوں نے یہ تذکرہ کہیں نہیں کیا ہے کہ حیدرآباد کے قیام کے دوران انھیں کبھی آصف سابع سے معافی مانگنا پڑا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اخراج کے واقعہ سے صرف دس ماہ قبل

ایک موقع پر آصف سابع کی جانب سے جوش سے جواب طلب کیا گیا تھا جس پر جوش نے معافی نامہ داخل کیا تھا۔ معافی نامہ داخل کرنے کے باوجود جوش کے خلاف بڑا سخت فرمان جاری ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد جوش کے لئے معافی مانگنے کا کوئی موقع نہیں رہ گیا تھا۔ اس واقعہ کے بارے میں جوش کی بیان کردہ تفصیلات کچھ یوں ہیں کہ نظام سابع کی ایک سالگرہ کے موقع پر ایک رسالہ کے مدیر نے انکی ایک بار یہ نظم قصیدہ بنا کر شائع کردی تھی جس میں سالگرہ کی جانب کوئی ادنیٰ سا اشارہ یا نظام کی مدح میں کوئی شعر نہ تھا مگر اس کے مقطع پر شاہی عتاب نازل ہوگیا۔

کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما
کبھی گل رخوں کی ثنا خوانیاں کر

دوسرے ہی دن فرمان شائع کیا گیا کہ معلوم ہوتا ہے ''یہ قصیدہ جوش نے کسی خاص وقت (ہنگام بادہ نوشی) میں کہا ہے۔ ان کو چاہیئے کہ وہ ایسے اوقات میں سرکار کو یاد نہ کریں۔ اگر وہ آئندہ ایسا کریں گے تو اچھا نہیں ہوگا۔'' جوش نے نظام سابع کے احکام کی جو تحریر درج کی ہے وہ سراسر غیر درست ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیگر تفصیلات بھی بیان کرنے سے احتراز کیا ہے۔ جوش نے جس **مقطع** کا حوالہ دیا ہے واقعی اسی **مقطع** پر جوش پر عتاب شاہی نازل ہوا تھا لیکن اس موقع پر نظام سابع کے جو احکام مورخہ ۱۶؍رجب ۱۳۵۲ھ م ۵؍نومبر ۱۹۳۳ء جاری ہوئے تھے وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

> **''جوش ملیح آبادی سے جواب لیا جائے کہ انھوں نے اخبار ''منشور'' کے سالگرہ نمبر میں جو نظم لکھی ہے، جس کا عنوان ''نعرہ جشن'' قرار دیا ہے اس کے مقطع میں جو الفاظ لکھے گئے ہیں، وہ سراسر رئیس کی سوء ادبی پر محمول ہوتے ہیں۔ پس ان کو چاہیئے کہ وہ آئندہ سے ایسے حرکات سے باز رہیں ورنہ ان سے سخت باز پرس کی جائے گی، جس صورت میں کہ بار دیگر ایسی غلطی ہوگی وہ بس۔''**

ان احکام کی تعمیل میں جوش نے جو معروضہ یا معافی نامہ مورخہ ۲۷؍رجب ۱۳۵۲ھ م

۱۶رنومبر ۱۹۳۳ء آصف سابع کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ اسٹیٹ آرکائیوز کی ایک مثل میں موجود ہے یہ معافی نامہ تین فل اسکیپ سایز کاغذات پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک شریف خاندان کے رکن ہیں اور شریف اپنے محسنوں پر جان نثار کردیا کرتے ہیں، یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے اتنے بڑے عظیم مرتبت محسن آعظم کی شان میں سوءادب کا تصور بھی اپنے ذہن میں لاتے جو محسن ہونے کے علاوہ اس کے قوم کا واحد تاجدار بھی ہے۔" صبح دکن کے سالگرہ نمبر کے لئے ایک تہنیتی نظم دینے کے بعد مدیران نظام گزٹ اور منشور نے اُن سے کلام دینے کے لئے اصرار شروع کیا۔ اسی اثناء میں وہ سخت بیمار پڑ گئے اور ایک دن انھوں نے بخار کی کیفیت میں اپنی جوش دارالترجمہ میں (۹) سال (۷) ماہ، (۲۴) یوم تک ملازمت انجام دینے کے بعد ۱۷ر جمادی الاول ۱۳۵۳ھ کو حیدرآباد سے واپس ہو گئے۔ ان کے وظیفہ کے تعین کی نسبت جو عرضداشت مورخہ ۲۸ر شعبان ۱۳۵۳ھ م ۶ر ڈسمبر ۱۹۳۴ء صیغہ تعلیمات کی جانب سے نظام سابع کی خدمت میں پیش کی گئی تھی اس میں باب حکومت کی یہ سفارش شامل تھی۔ سو روپیہ کلدار وظیفہ قابل منظوری ہے موٹر اور اگر کوئی زمین یا مکان ان کا ہو تو ان پر قبضہ کرلیا جائے جو قرضہ باقی ہے وہ قابل معافی ہے۔ اس عرضداشت پر حسب ذیل فرمان مورخہ ۱۷ر شوال ۱۳۵۳ھ م ۲۳ر جنوری ۱۹۳۵ء جاری ہوا۔

"کونسل کی رائے کے مطابق شبیر حسن جوش کے نام (ماء) روپیہ کلدار وظیفہ جاری کیا جائے مگر اس اس شرط کے ساتھ کہ وہ پھر کسی قسم کی نازیبا حرکت کرے گا تو یہ بعد ثبوت مسدود ہو جائیگا انہوں نے خرید موٹر کار اور تعمیر مکان کے لئے جو قرضہ حاصل کیا تھا اس کے معاوضہ میں جو موٹر کار اور مکان وغیرہ مکفول ہیں ان پر منجانب سرکار قبضہ کرلیا جائے۔ اس کے بعد اگر کوئی قرضہ باقی رہے تو ان کے وظیفہ سے بحساب فی ۲۵ روپیہ حاصل کرلیا جائے۔"

جو لوگ جوش کے قیام حیدرآباد کے دور کے حالات سے پوری طرح واقف نہیں ہیں وہ ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کرسکتے کہ حیدرآباد کے اُس دور کے حالات سے مطابقت پیدا کرنا کتنا

دشوار تھا۔ جوش کے تعلق سے آصف سابع کے فرمان میں درج الفاظ اور اس کے لب ولہجہ سے بھی کوئی غلط تاثر نہیں لینا چاہیے کہ جوش کا مرتبہ بلند نہیں تھا کیونکہ یہ لہجہ و زبان شاہی فرمان کی سرکاری وقانونی زبان تھی۔ نظام دکن بھی اگر جوش کے بلند مرتبہ کے معترف نہ ہوتے تو Out of the way جا کر انھیں ملازمت فراہم نہ کرتے اور اندرون دو سال ترقی دے کر حید رنظم طباطبائی جیسے جید عالم و دانشور کی جگہ انھیں مامور نہ کرتے۔ خفگی و ناراضگی کی انتہا اور عتاب کے باوجود ''ریاست بدر'' کئے جانے والے کو ۱۹۳۵ء میں ایک سو روپے کلدار وظیفہ کی منظوری دینا جوش کے مقام ومرتبہ کے اعتراف کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس زمانے میں یہ رقم آج کے ہزاروں روپے پر بھاری تھی۔

ایک بہار یہ غزل مدیر منشور کو دے دی جس میں انھوں نے محض اپنی ہی ذات سے خطاب کیا ہے۔ بخار کی شدت کے باعث ان سے جو غلطی سرزد ہوئی اس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ بہ کمال ادب معافی کے خواستگار اور نظام سابع سے عفوودرگزر کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔

نظام سابع کے متذکرہ بالا احکام سے پتہ چلتا ہے کہ ''منشور'' کے سالگرہ نمبر میں جوش کی جو نظم شائع ہوئی تھی اس کا عنوان ''نعرہ جشن'' تھا اور جوش نے اپنے معافی نامہ میں لکھا ہے۔ ''فدوی کو بے پایاں پشیمانی اور ملال کے ساتھ اپنی اس غلطی کا اعتراف ہے کہ اس نے اس غزل پر یہ تقریب سالگرہ کی سرخی کیوں قائم کردی۔'' ''یادوں کی برات'' میں جوش کا کہنا کہ اس میں نظام سابع کی سالگرہ کی جانب کوئی ادنیٰ سا اشارہ موجود نہ تھا قطعی درست نہیں ہے، معافی نامہ داخل کرنے کے باوجود جو فرمان مورخہ ۱۸رشعبان ۱۳۵۲ھ م ۷رڈسمبر ۱۹۳۳ء کو صادر ہوا تھا وہ حسب ذیل ہے:

> ''اس نے اپنی دیدہ ودانستہ غلطی کو جو ایک عذر لنگ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس سے درگذر کیا جائے تاہم میں اس شرط کے ساتھ معافی دیتا ہوں کہ آئندہ اگر پھر اس سے ایسی غلطی سرزد ہوئی تو (۲۴) گھنٹہ کے اندر اس کو خدمت سے علحدہ کردیا جائے گا کیونکہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم

ہوا ہے کہ اس کی پرائیوٹ لائیف ہرگز اطمیان کے قابل نہیں ہے اور ایسے کیرکٹر کے اشخاص کو سرکاری محکمہ میں جگہ دینا گویا محکمہ کی تذلیل ہے۔ یہی جواب اس کو بتوسط صیغہ متعلقہ دے کر کارروائی داخل دفتر کر دی جائے۔''

اوپر درج کئے گئے فرمان میں جوش کو مشروطہ طور پر معاف اور آئیندہ کے لئے سخت طور پر متنبہ کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد دس ماہ کے اندر ہی جوش پر پھر شاہی عتاب نازل ہوا اور وہ ریاست بدر کر دیئے گئے۔ اس سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر معافی نامہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہ گئی تھی تاہم یہ ممکن ہے کہ دلجوئی کی خاطر یا پزیرائی کی توقع پر جوش کے بہی خواہ انھیں معافی مانگنے کے لئے ترغیب دیتے رہے ہوں۔

جوش ملیح آبادی کی دُوبارہ حیدرآباد آنے کی کوشش

جوش ملیح آبادی کو آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کے احکام کی تکمیل میں ۱۹۳۴ء میں حیدرآباد چھوڑنا پڑا تھا۔ اس سے قبل اگرچہ انھوں نے دس سال ہی حیدرآباد میں گذارے تھے لیکن حیدرآباد کی یادیں کبھی بھی ان کے دماغ سے محو نہ ہو سکی تھیں۔ جوش کی کتاب ''یادوں کی برات'' میں آصف سابع کے دربار کے چند واقعات کے علاوہ دارالترجمہ کا تذکرہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اپنی اور دارالترجمہ کے دیگر مترجمین کی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دارالترجمہ دفتر کم اور دارالتفریح زیادہ تھا مگر ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ دارالترجمہ سے وابستگی نے انھیں غیر معمولی علمی فائدہ پہونچایا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حیدرآباد نے ان کی شاعری کو آب و رنگ بخشا اور علم و فکر کا راستہ دکھایا۔ جوش نے حیدرآباد میں گذرے ہوئے دنوں، یادگار محفلوں، مشاعروں رنگین شاموں اور احباب کی پرانی صحبتوں کو بڑے متاثر کن انداز میں اپنی اس کتاب میں یاد کیا ہے۔ اُس دور کے حیدرآباد کے بارے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ہائے کیا بیان کروں کہ اس وقت میرا حیدرآباد کیا چیز تھا ارزانی اور اس پر
دولت کی فراوانی ہر طرف اک چہل پہل تھی۔ امراء کے دروازوں پر صبح شام
نوبت بجا کرتی تھی۔ آئے دن جلسے مجرے دعوتیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔''

اس کتاب میں ''میرے چند خاص احباب'' کے عنوان کے تحت بھی جوش نے حیدرآباد کے بعض واقعات بیان کئے ہیں جن سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انھیں حیدرآباد سے گہری وابستگی تھی حیدرآباد سے جوش کی اسی گہری وابستگی اور لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ حیدرآباد سے اخراج عمل میں آنے کے بعد انھوں نے دوبارہ حیدرآباد آنے اور اپنے داخلہ پر امتناع کی برخواستگی کے لئے کوشش کی تھی یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی ان کوششوں میں سابق ریاست حیدرآباد کے خاتمہ تک کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ جوش نے اپنی کتاب میں اپنی ان کوششوں اور خواہشوں کا ذکر نہیں کیا ہے جبکہ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کے ریکارڈ سے جن میں جوش کے مکتوب بھی شامل ہیں اس بات کا واضح اور قطعی ثبوت ملتا ہے۔

جوش کے مکتوب مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۴۷ء (جس کا متن آگے بیان ہوگا) سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جوش نے حیدرآباد سے اخراج کے بعد کئی بار یہاں کے ارباب اقتدار سے حیدرآباد میں داخلہ کی اجازت کے سلسلہ میں خط و کتابت کی تھی۔ صیغہ تعلیمات کی عرضداشت مورخہ ۶ر محرم ۱۳۶۳ھ م ڈسمبر ر ۱۹۴۳ء یقیناً جوش کے مکتوب یا درخواست پر ہی پیش کی گئی ہوگی۔ اس عرضداشت میں ممالک محروسہ سرکار عالی میں جوش کو داخلہ دینے کی اجازت کے لئے سفارش کی گئی تھی اس عرضداشت میں معتمد تعلیمات کا نوٹ تھا لیکن بعدازاں بعض عام وجوہ کی بناء پر وہ خارج البلد کئے گئے اور نوکری سے بھی محروم ہوئے انھیں اب دوبارہ سروس میں لینے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا البتہ بردے سابقہ احکام شاہانہ وہ اب ممالک محوسہ سرکار عالی میں آ بھی نہیں سکتے جسے اتنے زمانے کے بعد قائم رکھنا اب شاید ضروری تصور نہ فرمایا جائے۔ معتمد تعلیمات کے نوٹ پر صدر المہام تعلیمات نے جوش کو صرف ممالک محروسہ میں داخلہ کی اجازت دینے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ یہ کاروائی اجلاس باب حکومت منعقدہ ۲۷ر ۱۳۵۳ف م ۳ر ڈسمبر ۱۹۴۳ء میں پیش ہوئی

جس میں حسب ذیل اراکین شریک تھے۔

(۱) سر عقیل جنگ بہادر صدارالمہام صنعت وحرفت

(۲) مہدی یار جنگ صدرالمہام تعلیمات

(۳) خسرو جنگ صدرالمہام فوج وطباعت

(۴) دھرم کرن صدرالمہام تعلیمات

(۵) ڈبلیو۔ڈی۔گریکس صدرالمہام مال وکوتوالی

باب حکومت کے اس اجلاس میں باتفاق طئے پایا کہ "شبیر حسین جوش ملیح آبادی کے متعلق بارگاہ خسروی میں سفارش کی جائے کہ اگر وہ صرف ممالک محروسہ سرکار عالی میں داخلہ کی حد تک عضو شاہانہ سے سرفراز فرمائے جائیں تو موجب مترحم ہوگا۔البتہ ان کو ان کی پچھلی روش کی بناء پر کوئی ملازمت نہیں دی جاسکے گی۔"

یہ عرضداشت نواب سر عقیل جنگ بہادر نائب صدر اعظم کی جانب سے پیش کی گئی تھی۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں جوش کے داخلہ کے لئے عرضداشت میں جو سفارش پیش کی گئی تھی اسے آصف سابع نے نامنظور کر دیا اس بارے میں آصف سابع کا جو فرمان مورخہ ۲۷ رمحرم ۱۳۶۳ھ م ۲۴ رجنوری ۱۹۴۴ء صادر ہوا تھا وہ حسب ذیل ہے:

"زمانہ پرآشوب ہے اور اسی شخص کا رویہ زمانہ گذشتہ میں کیا
تھا وہ بھی روشن ہے لہٰذا سابقہ حکم پر نظر ثانی نہیں ہوسکتی یعنی اس
کو ممالک محروسہ میں آنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔"

عرضداشت میں کی گئی سفارش کے رد کر دیئے جانے اور ان کے خلاف فرمان صادر ہونے کی اطلاع جوش کو ملی ہوگی اس لیے انھوں نے کچھ انتظار کیا اور تقریباً چار سال کی مدت گذر جانے اور ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد انھوں نے پھر ایک بار کوشش کی تھی کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں ان کے داخلہ پر سے امتناع برخاست کر دیا جائے گا کہ وہ دوبارہ حیدرآباد کے ماحول وفضاء میں سانس لے سکیں اور اپنے احباب سے مل سکیں چنانچہ انہوں نے ایک مکتوب

مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۴۷ء صدر اعظم ریاست حیدر آباد دکن کو لکھا تھا۔ اس مکتوب کا متن حسب ذیل ہے۔

''مکرمی،

اس سے قبل بھی متعدد بار عرض کر چکا ہوں اور آج بھی اس خط کے ذریعہ عرض کر رہا ہوں کہ حیدر آباد میں میرے داخلہ کے امتناع کو براہ کرم اجازت میں تبدیل کرا کے مجھے اس کا موقع دیجئے کہ وہاں کی ان گلیوں میں پھر ایک بار گشت کرلوں جہاں میں نے اپنی جوانی کے بہترین ایام صرف کئے اور ان دوستوں سے زندگی کے آخری لمحوں میں پھر ایک بار مل کر دل ٹھنڈا کرلوں جو خوابوں میں میرا تعاقب کرتے ہیں۔

کافر ہوں جوان دو مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ اور کوئی تمنا رکھتا ہوں۔ ذرا سی بات ہے آپ تحریک کردیں تو بڑی آسانی سے اس حکم کی تنسیخ ہو سکتی ہے جس نے حیدر آباد کو میرے واسطے شجر ممنوع بنا رکھا ہے۔

خدا کرے کہ آپ ہمہ وجوہ مع الخیر ہوں اور یہ خط آپ کو ایسے موڈ میں ملے کہ آپ اس وقت میرے حسب مراد کاروائی کا آغاز فرمادیں۔

آپ کا از یاد رفتہ نیاز مند
جوشؔ''

جوش کا اوپر بیان کردہ مکتوب ۱۹ر نومبر ۱۹۴۷ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس وقت مہدی یار جنگ ریاست حیدر آباد دکن کے منصرم صدر اعظم تھے مہدی یار جنگ جوش کے محسن اور قدر دان تھے اور جوش سے ان کے مراسم دوستانہ تھے۔ خود جوش نے ''یادوں کی برات'' میں لکھا ہے کہ حیدر آباد میں ملازمت کیلئے سر اکبر حیدری کا وسیلہ گنوانے کے بعد جوش کو مہدی یار جنگ اپنے والد عماد الملک کے پاس لے کر گئے تھے اور انھوں نے جوش کا اپنے والد سے اچھے الفاظ میں تعارف کرایا تھا۔ آصف سابع کے نام عماد الملک کی سفارشی درخواست پر ہی حیدر آباد میں جوش کی ملازمت کی کاروائی کا آغاز ہوا تھا۔

اس مضمون میں جس عرضداشت مورخہ ۲ رمحرم ۱۳۶۳ھ کا خوالہ دیا گیا ہے اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ صدرالمہام تعلیمات نے جوش کو مملکت محروسہ میں داخلہ دینے سے اتفاق کیا تھا۔ یہ صدرالمہام تعلیمات مہدی یار جنگ ہی تھے۔ یہی مہدی یار جنگ ۱۹۴۷ء کو منصرم صدر آعظم مقرر ہوئے تھے۔ جس کی اطلاع یقیناً جوش کو ملی ہوگی، اسی لئے جوش نے حیدرآباد میں داخلہ پر امتناع برخواست کروانے کے لئے انھیں مذکورہ بالا خط لکھا تھا۔ جوش کے اس مکتوب پر پیشی صدر اعظم کے دفتر میں ۲۷ رنومبر ۱۹۴۷ء کو مثل پر کاروائی کا آغاز ہوا ہی تھا کہ دوسرے روز حیدرآباد میں وزارت تبدیل ہوگئی۔ مہدی یار جنگ ۳۱ راکٹوبر ۱۹۴۷ء کو (۶) ماہ کے لئے منصرم صدر اعظم بنا دیئے گئے تھے مگر ۲۸ رنومبر ۱۹۴۷ء کو انٹریم گورنمنٹ کا قیام عمل میں آیا۔ لائق علی صدر اعظم مقرر ہوئے اور مہدی یار جنگ سبکدوش کر دیئے گئے (ملاحظہ ہو جریدہ غیر معمولی مورخہ ۳۱ رآذر ۱۳۵۷ف م ۳۱ راکٹوبر ۱۹۴۷ء اور جریدہ غیر معمولی مورخہ ۲۷ ردے ۱۳۵۷ ف م ۲۸ رنومبر ۱۹۴۷ء) مہدی یار جنگ کے ہٹ جانے سے جوش کی درخواست کو تائید حاصل نہ ہو سکی اور ایک مراسلہ مورخہ ۲۷ ربہمن ۱۳۵۷ف م ۲۷ ردسمبر ۱۹۴۷ء منجانب معتمد باب حکومت جوش کو روانہ کیا گیا جس میں اطلاع دی گئی ''افسوس ہے کہ فرامین خسروی کی روشنی میں دفتر ہذا مزید کاروائی کرنے سے قاصر ہے۔''

متذکرہ بالا مراسلہ وصول ہونے پر جوش نے حسب ذیل خط مورخہ ۳۱ رڈسمبر ۱۹۴۷ء مددگار معتمد باب حکومت کے نام لکھا۔

''مراسلہ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ فرمان خسروی کی روشنی میں دفتر ہذا مزید کروائی کرنے سے قاصر ہے چلئے بہت اچھا ہوا۔ انقلاب سے پیشتر حیدرآباد کی سیر میں لطف بھی نہ آتا۔

پیچ وتاب اس قدر اے موج عبث ہے تجکو
رول دیویگا نہ موتی مجھے دریا ترا

جوش''

جوش نے اس مکتوب میں اپنے دستخط ثبت کرنے کے بعد خواہش اور آرزو کی تکمیل کے

لئے پولیس ایکشن تک انتظار کیا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ انقلاب رونما ہو چکا تھا جس کی جانب شاعر انقلاب نے اپنے مکتوب میں اشارہ کیا تھا۔ حیدرآباد بدر کئے جانے کے احکام بے اثر ہو چکے تھے اور اب حیدرآباد جوش کا پر جوش استقبال کرنے لے لئے بے چینی سے منتظر تھا۔

☆☆☆

جوش ملیح آبادی اور کشمیر

غلام نبی خیال

گزشتہ صدی کی چوتھی دہائی میں ہندستان اور کشمیر میں آزادی کی تحریکیں باضابطہ طور پر ایک ساتھ شروع ہوئیں۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں ''بھارت چھوڑ دو'' کی تحریک حریت کے بعد مئی 1946ء میں کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی رہنمائی میں ''کشمیر چھوڑ دو اور بیع نامہ امرتسر کو توڑ دو'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے غلام کشمیری عوام آزادی کا پرچم لہراتے شخصی حکومت سے نجات حاصل کرنے کا عزم کر کے میدان میں کود پڑے۔

بیع نامہ امرتسر اُس بدنام زمانہ سودابازی کا نام ہے جو پنجاب کے شہر امرتسر میں 16 مارچ 1846ء کو طے پائی جس کی رو سے انگریز سامراج نے جموں کے دوگرہ گلاب سنگھ کے ہاتھ سارا کشمیر بشمولِ انسان وحیوان اور چرند و پرند صرف 75 لاکھ نانک شاہی روپے میں فروکت کر دیا جو آج کے پچاس لاکھ روپے کے برابر ہوتے ہیں۔

اس انسان کش بیع نام پر اقبال نے یوں اظہار رائے کیا:

بسادِ صبا اگر بہ جنیو اگذر کنی
حرفے زمانہ مجلس اقوام باز گوئے
دھقان وکشت وجوئے و بیان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

مہاتما گاندھی نے اسے بکری پتر کا نام دیا۔ جواہر لال نہرو نے اسے ریاستی عوام کی

غلامی کی دستاویز کہا۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے اسے نیلامی کے نام کا سند نامہ قرار دیا اور مولانا غلام رسول مہر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ”1846ء میں انگریزوں نے کشمیر کو اس طرح فروخت کیا کہ امریکی آباد کاری کے ابتدائی دور میں حبشی غلام بھی شاید اس طرح بکے ہوں“۔

حفیظ جالندھری نے اس غیر انسانی اور بہیمانہ فعل کے شرمناک پہلوؤں پر یہ طنز کیا:

وادیاں، کہسار، جنگل، پھول پھل اور سب اناج
ڈھور ڈنگر آدمی ان سب کی محنت کام کاج
یہ مویشی ہوں کہ آدم زاد ہیں سب زر خرید
ان کے بچے بچیاں اولاد ہیں سب زر خرید

گلاب سنگھ کے پاس اُس وقت چونکہ ساری رقم موجود نہیں تھی لہٰذا اُس نے بقیہ پچیس لاکھ اکتوبر کی پہلی تاریخ تک ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس طرح سے انگریزوں نے چند روپے فی کس کے حساب سے پوری کشمیری قوم کو ڈوگرہ راج کے چنگل میں دے دیا۔

غلام ہندوستان کی حالت زار کو دیکھ دیکھ کر علامہ اقبال اس لحاظ سے اس ناگفتہ بہ صورتحال سے دوگونہ پریشان اور دل برداشتہ تھے کہ سارے ملک کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا وطن مالوف کشمیر بھی شخصی راج کے آہنی پنجے تلے کراہ رہا تھا اور عام کشمیری ظلم واستبداد کی چکی میں پس رہا تھا۔ اس صورت میں عام لوگوں کی بے حسی اور بے دلی کا مشاہدہ کر کے انہوں نے کشمیر کے بارے میں یہ نوحہ لکھا:

کشیری کہ بابندی گی خوگرفتہ
بتے بھی تراشہ زسنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی ناشناسے زخود شرم سارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینہ او دل بے قرار

اور:

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تاخاک بخارا و سمر قند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغان سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

جوشؔ ملیح آبدی کا دل بھی وطن کی غلامی پر خون کے آنسو روتا تھا اور اقبال کی طرح اسے بھی یہ قلق تھا کہ ہندی قوم اپنی آزادی کے لئے جان بکف ہو کر میدان کارزار میں کودنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ اس لئے وہ اپنے ہم وطنوں کو ''ذلیل غلامانِ روسیاہ'' کہہ کے پکارتے ہیں اور خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ انہیں ہندوستان میں کیوں پیدا کیا؛

میرے رجز سے لرزہ براندام ہے زمیں
افسوس تیرے کان پر جوں رینگتی نہیں
تو چپ رہا، زمین ہلی، آسما ہلا
تجھ سے تو کیا خدا سے کروں گا میں یہ گلا
ان بزدلوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کیوں
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں؟

ہندوستان کی آزادی کے لئے جن لاتعداد سرفروشوں اور عام شہریوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا، آزادی کے بعد اُن کی حالت جوں کی توں رہی اور آزاد ہند کے فوائد صرف اُن افراد تک ہی محدود ہو کے رہ گئے جنہوں نے آزادی کے نام پر عام لوگوں کا استیصال اور ذاتی مفادات کے حصول کو اپنا شعار بنالیا تھا۔

جوشؔ ملیح آبادی نے بھی ایک عوام پرور آزادی کا خواب دیکھا تھا لیکن 1947ء کے

بعد جو کچھ ان کی نظروں نے دیکھا اس کی وجہ سے وہ بیحد رنجیدہ ہوئے اورنہوں نے نظم ''ماتم آزادی''میں اپنی اس مایوسی کا اظہار یوں کیا:

دولت ملی تو اور بھی نادار ہوگئے
صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہوگئے
اُترا جو بار اور گراں بار ہوگئے
آزاد یوں ہوئے گرفتار ہوگئے
پگھلا جو آسماں تو زمیں تنگ ہوگئی
''یوں پو پھٹی کہ صبح چمن دنگ ہوگئی''

شاعر کہیں کا بھی ہو لیکن اُس کا ذہن دوسرے خطوں سے تعلق رکھنے والے ہم سخنوں کے ساتھ فکری طور پر ہمیشہ وابستہ رہتا ہے۔ اسی لئے کئی شاعروں کے یہاں ہم خیالات اور محسوسات کی یکسانیت اور یک رنگی حیران کن حد تک موجود پاتے ہیں۔ اُدھر جوشؔ نے نام نہاد آزادی پر طنز کرتے ہوئے مندرجہ صدہا اشعار کہے اور اِدھر شاعر کشمیر غلام احمد مہجورؔ نے بھی ہند کی آزادی کے بعد اسی قسم کے خیالات کو اظہار کی شکل دی۔ یہ اشعار دراصل کشمیری میں ہیں اور ان کا اردو ترجمہ کیفی اعظمی نے یوں کیا ہے:

آزادی ہمارے گھر آئی آزادی کا کیا کہنا
آتی نہیں تھی پر آئی آزادی کا کیا کہنا
یہ محلوں پر منڈلاتی ہے سونا چاندی برساتی ہے
سب کھنڈروں سے شرماتی ہے جب آئی جھکا کے سر آئی
بھوکوں کو بہلائے کیسے پیاسوں کو چھلکائے کیسے
جنتا کو سمجھائے کیسے اوروں کی تجوری بھر آئی
سب روتے ہیں کچھ گاتے ہیں سب کھوتے ہیں کچھ پاتے ہیں
پھل محنت کے لُٹ جاتے ہیں انصاف عجب لے کر آئی

آزادی ہمارے گھر آئی

کشمیر پر جوشؔ کی کہی ہوئی دو نظمیں ''اے جوانانِ کشمیر'' اور ''اُنے جنّت کشمیر'' آج بھی اہل کشمیر کے قلب ونظر کو جذبۂ حب الوطنی اور حریت پرستی کے جذبات سے گرماتی ہیں۔

ان منظومات میں جوشؔ نے حسب عادت اپنے زوردار سلوب کے ذریعہ اہل کشمیر کے تئیں آزادی اور جمہوریت کے لئے ان کی جدو جہد کے ساتھ زبردست یکجہتی کا برملا اظہار کیا ہے۔ یہ دونوں نظمیں چونکہ اب تقریباً ناپید ہیں لہٰذا انہیں یہاں من وعن درج کرنا قارئین کی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا:

اے جوانانِ کشمیر

اے جنتِ کشمیر کے بیدار جوانو
اے ہمت مردانہ کے ذی روح نشانوں
سو بات کی یہ بات ہے اس بات کو مانو
جینے کا جو ارمان ہے تو موت کی ٹھانو

بے غرق ہوئے کوئی اُبھر تا ہی نہیں ہے
جو قوم پہ مرتا ہے وہ مرتا ہی نہیں ہے

بے ذوقِ وفا کوئی تہمتن نہیں بنتا
بے سلسلۂ برق نشیمن نہیں بنتا
سونا نہیں تپتا ہے تو کندن نہیں بنتا
جو گھن نہیں کھاتا ہے وہ آہن نہیں بنتا

جنگل میں جو لذت کش پیکاں نہیں ہوتا
وہ شیر کبھی شیر نیستاں نہیں ہوتا

سوتے ہوئے دھارے کبھی طوفاں نہیں بنتے
جو قید نہ ہوں یوسف کنعاں نہیں بنتے

مرتے جو نہیں عیسائے دوراں نہیں بنتے
جو موت سے ڈرتے ہیں وہ انساں نہیں بنتے

بے سوز نمِ اشک فشانی نہیں ملتا
بے آگ میں کودے ہوئے پانی نہیں ملتا

کمزور کو آسودگئ دل نہیں ملتی
جب تک نہ جلے شمع کو محفل نہیں ملتی
کانٹوں سے جسے لذت کامل نہیں ملتی
اس رہرو نا اہل کو منزل نہیں ملتی

گرداب میں جس شخص کو جینا نہیں آتا
اُس شخص کا ساحل پہ سفینہ نہیں آتا

جب تک کہ ہر اک ذرہ پر افشاں نہیں ہوتا
اک پھول بھی گلزار میں خنداں نہیں ہوتا
گلشن میں کبھی رقص بہاراں نہیں ہوتا
جب تک کہ ہواؤں پہ گریباں نہیں ہوتا

جب تک دل یوسف پہ گرانی نہیں آتی
رخسار زلیخا پہ جوانی نہیں آتی

ہوتا ہے تلاطم کا اب آغاز جوانو
سیلاب میں در آؤ بصد ناز جوانو
یہ موج یہ گرداب ہے جانباز جوانو
دو وقت کی آواز پر آواز جوانو

دنیا میں کسی خوف کے قابل نہیں ہوتے
جو شیر کے بچے ہیں وہ بزدل نہیں ہوتے

طوفان کو ٹھکراؤ ہواؤں کو بدل دو
دریاؤں کو روندو تو پہاڑوں کو کچل دو
مردانہ بڑھو موت کو پیغام اجل دو
پھولوں کی تمنا ہے تو کانٹوں کو مسل دو

تخریب کا جب تک کہ تلاطم نہیں آتا
تعمیر کے ہونٹوں پر تبسم نہیں آتا

سینوں کو چلو عرصۂ ہمت میں ابھاریں
ہاں آؤ طمانچہ رُخِ سیلاب پر ماریں
شیروں کی طرح آؤ کچھاروں میں ڈکاریں
پلتی ہیں سدا خون کے دھاروں میں بہاریں

عزت کو خرابات قرینے نہیں دیتی
دُنیا کبھی نامرد کو جینے نہیں دیتی

اے جنتِ کشمیر

عالم تیری برنائی گل رنگ کا شیدا
کونین کے دل میں ترے جلوے کی تمنا
آفاق کے شانے پر تیری زُلفِ گرہ گیر
اے جنتِ کشمیر اے جنتِ کشمیر
ہاں تجھ کو جلانے کی تمنا میں مریں گے
چلتی ہوئی تلوار سے ہم قطع کریں گے
پہنائیں تو اغیار ترے پاؤں میں زنجیر
اے جنتِ کشمیر اے جنتِ کشمیر

منڈلائیں گے شاہیں جو تری پاک فضا پر
اغیار نیاموں سے نکالیں گے جو خنجر
ہم جنگ کے میدان میں چمکائیں گے شمشیر
اے جنتِ کشمیر اے جنتِ کشمیر
ظلمات کو رنگ اپنا جمانے نہیں دیں گے
اُس خاک پہ ہم رات کو چھانے نہیں دیں گے
جس خاک کا ہر ذرہ ہے خورشید کی تصویر
اے جنتِ کشمیر اے جنتِ کشمیر

اس کے بعد جوشؔ ملیح آبادی کا ایک بار اور کشمیر آنا ہوا جس کی تفصیلات دستیاب نہیں کہ کیا وہ دورہ نجی تھا یا پھر کسی مشاعرے میں اُن کی شرکت کے لئے انہیں دعوت دی گئی تھی۔ بہر حال اس دورے کی تصدیق میں انہوں نے جنتِ کشمیر میں آدم کی واپسی کو تمثیلی طور پر پیش کرتے ہوئے یہ باغیانہ اعلان کیا:

ممنوعہ شجر سے لطف پیہم لینے
نسیاں کی گھنی چھاؤں میں دم لینے
آواز دو پھر کاشمر آپہنچا جوشؔ
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

چونکہ 1931ء میں جب کشمیر کی تحریک حریت کی داغ بیل ڈالی گئی تو اُسی سال جوشؔ نے ایک مشہور رباعی تحریر کی جس کے مضمون کے بارے میں یہ زبردست امکان موجود ہے کہ اُس کا تعلق کشمیر ہی سے ہے:

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی
ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر

غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

41-1940ء کے آس پاس جوشؔ ملیح آبادی ایک کل ہند مشاعرے میں شرکت کرنے کی غرض سے کشمیر آئے تو یہاں وادی کے سب سے مقبول سیاسی رہنما شیخ محمد عبداللہ نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ یہ تاریخی مشاعرہ سرینگر میں ایس پی کالج کے ہال میں منعقد ہوا جس میں بقول امین کامل ''جوشؔ کے علاوہ حفیظ جالندھری اور فراقؔ گورکھپوری بھی موجود تھے''۔ جوشؔ کو شیخ صاحب سے زبردست عقیدت تھی اور کشمیری عوام میں اُن کی بے مثال مقبولیت کو دیکھ کر اس جذبۂ احترام میں اور اضافہ ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے جوشؔ نے دیکھا کہ شیخ صاحب سامعین میں خواتین کے ایک مجمع کے قریب بیٹھے ہیں تو انہوں نے شیخ صاحب کو آواز دی ''قبلہ! اب زنانے سے ذرا مردانے میں تو تشریف لائیے'' اور اس کے بعد جوش ملیح آبادی نے اپنی گھن گرج دار آواز میں شیخ عبداللہ کی مدح سرائی میں یہ نظم سنائی:

کشور ہند میں بحمد اللہ
میں ہوں جوشؔ ایک رند نامہ سیاہ
لعل و الماس سے دمکتی ہے
فقر کے باوجود میری کلاہ
میرے آگے وہ بحرے ہے پایاب
نہیں ملتی خضرؔ کو جس کی تھاہ
سرکشی کے طفیل وہ لاہوں
نہیں بڑھتا جو سوے الا اللہ
طرح دارانِ شہر کا خادم
تاجداران دہر کا بد خواہ
کام ہے شیخ سے نہ پنڈت سے
دیر ہی پر ہے نے حرم پہ نگاہ

رند ہوں رند نبھ نہیں سکتی
شیخ صاحب سے میری رسم وراہ
ان کی محفل میں ہے چراغ ثواب
میری محفل میں آفتابِ گناہ
ان کی لوح جبیں پہ داغ سجود
میرے آئینے میں تجلی ماہ
ہاں مگر ایک شیخ ہے ایسا
جس پہ ٹھہری ہے مدتوں میں نگاہ
جس کی ہر اک روش ہے حسب مراد
جس کا ہر اک اصول ہے دل خواہ
تخت کو توڑتا ہے جس کا نفس
تاج کو روندتی ہے جس کی نگاہ
ہے جو اس تیرہ دورِ باطل میں
حق نگہ حق شناس حق آگاہ
نام اس شیخ کا بتاؤ تمہیں
دل رنداں میں بھی ہے جس کی چاہ
چارہ گر رہنما غریب نواز
شیر کشمیر شیخ عبداللہ
صرف اسی شیخ سے محبت ہے
ورنہ ہر شیخ سے خدا کی پناہ

شیخ محمد عبداللہ نے اپنے سوانح حیات میں جوشؔ کے تئیں اپنی شفقت اور قربت کا ان لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ ''قبلہ رندان جوش ملیح آبادی بھی میرے پرانے دوستوں میں سے

تھے۔ ان کا پٹھانوں کا طنطنہ اوران کا شاعرانہ جلال انہیں خاصے کی شخصیت بنادیتا ہے۔ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد ان کے قدر دانوں میں سے تھے۔ وہ مئے گلفام کے بڑے رسیا ہیں چونکہ میں کبھی اس شئے کی طرف رغبت پیدا نہین کر سکا اس لئے وہ کبھی کبھی اپنے شاعرانہ انداز میں مجھے چھیڑتے بھی رہتے تھے۔ انہوں نے میرے بارے مین نظم لکھی۔ اس نظم میں بھی چھیڑ خوانی کا یہ انداز موجود ہے۔ بعد میں جوش صاحب اپنے کچھ دوستوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر پاکستان چلے گئے۔ ان کے جانے سے اُن کے دوستوں کو صدمہ تو ہوا ہی لیکن خود جوش بھی مزے میں نہ رہے''۔

یہ چھوٹی سی بات بھی حسنِ اتفاق ہے کہ جوش اور عبداللہ دونوں کی تاریخ پیدائش ایک ہی ہے۔ جوش 5/دسمبر 1898ء کو اس عالم ہست و بود میں آئے اور شیخ عبداللہ اسی دن 1905ء میں پیدا ہوئے۔ گویا جوش عمر میں عبداللہ سے سات سال بڑے تھے۔ یہ واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کہ دونوں کا انتقال ایک ہی سال یعنی 1982ء میں ہوا۔

پاکستان جانے کے بعد وہاں کی سرکار نے اگرچہ جوش کو شاعرانِ پاکستان میں شامل کر کے اُن کے نام سے پانچ روپے کا ایک یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا لیکن وہ اپنے قیامِ پاکستان کے بارے میں یہی کہتے رہے

یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفے میں حسین

شیخ محمد عبداللہ کی یہ رائے صحیح ثابت ہوئی کہ جوش آخری دم تک پاکستان میں بدمزگی کے دن گزارتے رہے۔

1953ء میں ریاست کے وزیراعظم شیخ محمد عبداللہ کی سرکار کو برخاست کئے جانے کے ساتھ ہی ان کی گرفتاری کے بعد ریاست میں سیاسی حالات ایک یا دوسری طرح دگرگوں ہی رہے اور اس فردوس ارضی کو بدقسمتی سے متواتر طور پر ایک پرامن ماحول، سازگار فضا اور ترقی پزیر معاشرہ نصیب نہیں ہوسکا۔

یہ بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے کہ 1953ء کے بعد جوش ملیح آبادی پھر کبھی کشمیر نہیں آئے

لیکن وہ یہاں کے اپنے مختصر قیام کی تلخ وشیریں یادیں دل میں بسائے کشمیر کو دور سے تصورات میں دیکھتے رہے ہوں گے اور اس کے عوام کی بہتری اور بہبود کی دعائیں انہوں نیا قبالؔ کے اس شعر کی طرح ضرور اور بار بار مانگی ہوں گی

ازاں مئے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

حوالہ جات ---

(1)۔ یہ شعر ''جاوید نامہ'' میں درج ہے جس کی اشاعت 1932ء میں ہوئی۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ مسئلہ کشمیر اس کے پورے سولہ سال بعد مجلس اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا۔

(۲)۔ اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر، غلام نبی خیالؔ، کشمیری رائٹرس کانفرنس، سرینگر کشمیر، 1997، ص21

(۳)۔ خیابان کشمیر، مرتبہ غلام نبی خیالؔ، جموں وکشمیر کلچرل اکادمی سرینگر۔ 1988، ص112

(4)۔ حیرت ہے کہ کشمیر پر جوشؔ تحریر کردہ دو نظمیں اور شیخ عبداللہ پر اُن کی یہ نظم حال ہی میں اشاعت پذیر کلیات جوشؔ ملیح آبادی میں شامل نہیں ہیں۔

(5)۔ آتشِ چنار، شیخ محمد عبداللہ۔ علی محمد اینڈ سنز سرینگر۔ 1886، ص268-267

جوشؔ اور پونہ

نذیر فتح پوری

جوشؔ اور ساغرؔ نظامی فلموں میں گیت لکھنے کی غرض سے فروری ۱۹۴۳ء میں پونہ آ چکے تھے۔ ان کا قیام طاہر پیلس، ۳-۱۷۱/ گنج شکر پیٹھ، پونہ میں تھا۔ دوہری منزل کے اس گھر کے بالائی حصے میں ساغرؔ نظامی اور نیچے جوشؔ اپنے خاندان کے ساتھ مقیم تھے۔ دونوں شالیمار پکچرز کے لیے گیت اور مکالمے لکھنے کی ذمہ داری نبھاتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے:

> ''ادھر جوشؔ کی کافی شہرت تھی، ان کے متعدد شعری مجموعے چھپ چکے تھے اور اس طرح وہ مقبول خواص وعوام تھے۔ مگر اس مقبولیت کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ مراٹھی اور گجراتی اخبارات میں ان کے بارے میں مضامین چھپ چکے تھے اور اس لحاظ سے پونے کے غیر اُردوداں حضرات بھی ان سے متعارف تھے اور جوشؔ کو کہیں دیکھتے تو اس کی توثیق کرتے کہ آیا وہ جوشؔ ہیں۔'' (پونے کے مسلمان، ص:۱۹۷)

جوشؔ نے 'یادوں کی بارات' میں اپنے پونہ میں قیام کا ذکر کیا ہے۔ دلوی صاحب کی کتاب 'پونے کے مسلمان' کے مطالعہ سے انکشاف ہوتا ہے کہ جوشؔ کے بیٹے سجاد حیدر خان نے پونے میں اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ایک کوکنی مسلمان محمد فقیہہ کی بیٹی انور خانم سے شادی کی تھی۔

جوشؔ نے فلم 'من کی جیت' کے گیت پونہ ہی میں لکھے۔ پونہ آنے سے قبل ۱۹۴۲ء میں

جوشؔ کی ایک غزل پونہ کے ایک ادبی رسالے 'گلزارِ سخن' میں شائع ہوئی تھی۔

''پونہ اور جوشؔ'' تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے۔ جوشؔ نے پونہ میں مشاعرے بھی پڑھے۔ اور یہاں کے شعراء سے انکی ملاقاتیں بھی رہیں۔ لیکن 'یادوں کی بارات' میں جوشؔ نے پونے کے کسی مشاعرے یا شاعر کا ذکر نہیں کیا۔ ظاہر ہے اس وقت، شاد پونوی، خاک پونوی اور سلیم چشتی جیسے اساتذہ پونہ میں موجود تھے۔ لیکن جوشؔ نے کسی کا ذکر نہیں کیا۔

دلوی صاحب نے افکار پاکستان کے جوشؔ نمبر کے حوالے سے لکھا ہے کہ شالیمار کمپنی کے مالک ڈبلیو زیڈ احمد سے باتیں کرتے کرتے جوشؔ نے 'احمد سے خطاب' کے عنوان سے ایک نظم فی البدیہہ کہی جو مندرجہ ذیل ہے:

احمد سے خطاب

رخِ روشن پہ دھواں دیکھ کے بیداری کا
میں نے کل صبح کو احمد سے بہ شفقت یہ کہا
کہ میاں نیند سے ہر رات کو کھیلا نہ کرو
غار امراض میں یوں خود کو ڈھکیلا نہ کرو
تخمِ عشرت چمن زیست میں بونے کے لیے
نوجوانی تو ہے اینڈ اینڈ کے سونے کے لیے
کیا جوانی ہے یہ آئندہ زمانے کے لیے
فرشِ مخمل پر بڑھاپے کو سلانے کے لیے
دولتِ عمر لٹی جاتی ہے بے حد و حساب
کیا بڑھاپے میں مع سود ملے گا یہ شباب
روز جاگو گے تو اُمید کدھر جائے گی
یہ کماں فرصت عصیاں کی اُتر جائے گی
حیف ہر لمحہ کہانی ہے تو ہر آن پلاٹ

کٹ کا ہنگامہ کبھی اور کبھی شاور اسٹارٹ
کمیرہ کوئی دکھاتا ہے تو کوئی راپی
اور رشز کی بھی رہا کرتی ہے آپا دھاپی
مجھ سے یہ حرف بزرگانہ جب احمد نے سنا
پہلے تو نرم تبسم سا لبوں پر کھیلا
مسکرانے میں کھلے گلشنِ ادراک کے پھول
جیسے نادان نے دانا کو دیا درس فضول
اور پھر کہنے لگے ایش ٹرے کو چھوکر
آپ کا حرف نصیحت مرے سر آنکھوں پر
یہ مسلّم ہے کہ آئے گی قیامت کی زمیں
بر سر کرسی و بالائے سرِ عرشِ بریں
بخت بیدار ہوتو نیند سے رونا کیسا
سامنے ڈھیر ہو چاندی کا تو سونا کیسا

جوشؔ کے چند منتخب اشعار:

جس کو تم بھول گئے یاد کرے کون اس کو؟
جس کو تم یاد ہو وہ اور کسے یاد کرے
سحر تک چاند مرے سامنے رکھتا ہے عکس اُن کا
ستارے شب کو مرے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں
یہ سن کر ہم نے میخانے میں اپنا نام لکھوایا
جو میکش لڑکھڑاتے ہیں وہ بازو تھام لیتے ہیں
برتاؤ دوستی کے حد سے نکل گئے ہیں
یا تم بدل گئے ہو یا ہم بدل گئے ہیں

مری حالت تری فرقت میں سنبھل جائے گی
کیا یہ دنیا ہے کہ دو دن میں بدل جائے گی
جو موقع مل گیا تو خضر سے یہ بات پوچھیں گے
جسے ہو جستجو اپنی وہ بیچارے کہاں جائیں
وہ خود عطا کرے تو جہنم بھی ہے بہشت
مانگی ہوئی نجات مرے کام کی نہیں
یا رب یہ بھید کیا ہے کہ راحت کی فکر نے
انساں کو اور غم میں گرفتار کر دیا
حشر میں بھی خسروانہ شان سے جائیں گے ہم
اور اگر پرسش نہ ہوگی تو پلٹ آئیں گے ہم

جوشؔ اور ساغر کی پونہ آمد کے بعد لکھا گیا ایک پرچہ غنی ثانی کے ذریعہ دستیاب ہوا۔ جو مندرجہ ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پسِ پردہ تقدیر پدید

کچھ عرصہ سے ہندوستان کے مایۂ ناز شاعرانِ شیریں سخن حضرت جوشؔ ملیح آبادی و عالیجناب ساغر نظامی بتقریب خاص پونہ میں قیام پذیر ہیں۔ خیال تھا بلکہ جی چاہتا تھا کہ کسی موقع سے حضرات موصوف کو کلام سنانے کی زحمت دی جائے۔ چنانچہ خوش قسمتی وحسن اتفاق سے ایسا وقت آ ہی گیا کہ ہماری دیرینہ درخواست کو صاحبان والہ جاہ نے شرف قبولیت عطا فرمایا۔ مناسب نہیں تھا کہ تنہا اس موقعہ سے لطف اندوز ہوں اس لیے ایک صحبت خاص مرتب کی گئی ہے تاکہ چند احباب کو بھی کیف اندوز ہونے کا موقع حاصل ہو۔ لہٰذا احباب ذیل شعرا و سامعین کو اس صحبت خاص میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ اُمید کہ آپ حضرات رونق بزم ہوکر شکر گزار فرمائیں۔

شعرا حضرات سے گزارش ہے کہ صرف وہ اہلِ سخن اپنا کلام سنائیں گے جن کا نام نامی پروگرام میں شامل ہوگا اور جن کو صدر جلسہ طلب فرمائیں گے۔ اور پڑھنے والے اصحاب کا یہ اخلاقی فرض ہوگا کہ وہ صرف منتخب اور کم سے کم کلام ارشاد فرمائیں۔''

تحریر کے اوپر نیچے مکتوب نگار یا الداعی کا نام نہیں ہے۔ تاریخ بھی موجود نہیں۔ البتہ ایک دوسرے پرچے کی دریافت سے یہ انکشاف ہوا کہ بروز اتوار، ۲۹ مئی ۱۹۴۳ء کو ایک غیر طرحی مشاعرہ جوش صاحب کی صدارت میں ویتال پیٹھ کی حافظ منزل میں منعقد ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل شعراء نے اپنا کلام پیش کیا تھا:

صغیر اجمیری۔ ثمر جالندھری۔ فیض کھڑکی۔ یعقوب۔ فیض پونوی۔ صلاح الدین علیگ۔ عاصی جالندھری۔ نیر سلیمی پونوی۔ عیاں کریمی۔ رسا در بھنگوی۔ پروفیسر عبدالحق پونوی۔ موج قریشی لکھنوی۔ الطاف احمد خان۔ اختر صاحب۔ صہبا صاحب۔ افضل صاحب۔ آشنا صاحب۔ عارف صاحب۔ ساغر نظامی اور جوش ملیح آبادی۔

۱۹۲۳ء میں پونہ سے شائع ہونے والے ایک ادبی رسالے ''گلزارِ سخن'' میں جوش کی شائع کردہ غزل کا ذکر ابتدا میں آیا ہے جو درج ذیل ہے۔

غزل...... حضرت جوش ملیح آبادی

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے گیسو ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا نکھر چلا ہے اُفق پہ سرخی سی چھا رہی ہے

روش روش نغمۂ طرب ہے چمن چمن ساز چھڑ رہے ہیں
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خوان کلی کلی چہچہا رہی ہے

سماعت آغوشِ سوز میں ہے نگاہ دامن میں بجلیوں کے
ہر ایک ذرہ غزل سرا ہے، ہر ایک شئے جگمگا رہی ہے

ضرور کوئی دراز مژگاں ہٹا رہا ہے نقاب رخ سے
فضول تاروں میں ہے تلاطم یہ شمع یوں جھلملا رہی ہے

جڑا ہوا ہے بلندیوں پر فلک کی باریک آئینہ سا
اس آئینے میں عروس تخیل اپنے گیسو بنا رہی ہے
سحر کو مدِ نظر ہیں کتنی رعایتیں چشمِ خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے
جگر میں پھر درد بڑھ رہا ہے چٹکتی کلیوں! ذرا ٹھہرنا
ہوائے تازہ کی نرم رو مین یہ کس کی آواز آرہی ہے
ضرور آئینہ دیکھنے میں ترے لبوں پہ تھا کچھ تبسم
جھکا نہ شرما کے یوں نگاہین، تری نظر مسکرا رہی ہے
غضب کی بد مست دلربا ہے، یہ جوشؔ نوخیز پھول والی
چمن میں سرخ انگھڑیوں کو ملتی ہتھیلیوں سے جو آرہی ہے
(بحوالہ گلدستہ گلزارِ سخن۔ ایڈیٹر محمد جیب اللہ خان حجازی میرٹھی نگراں موج قریشی لکھنوی۔ جلد تیسری۔ شمارہ نمبر ۸۔ صفحہ نمبر: ۲۶۔۲۷۔

ان دونوں پونہ مین 'یوم اقبال' کے سلسلے مین ہر سال مشاعرے ہوتے تھے۔ چند ایک مشاعروں میں جوشؔ صاحب بھی شرک ہوئے تھے۔ جناب امینِ حزیں نے بتایا کہ یوم اقبال کا ایک مشاعرہ اعظم کیمپس کے اسمبلی ہال میں ہوا تھا جس میں جوشؔ موجود تھے۔

پونہ میں اپنے قیام کے سلسلے میں جوشؔ 'یادوں کی برات' میں لکھتے ہیں:

''پونے کے موسم کا اعتدال، وہاں کے مناظر، وہاں کی دلفریب صبحیں اور شامیں، وہاں کی پابندِ اوقات برسات اور وہاں کی پہاڑیاں ایسی چیزیں تھیں جن کو آج تک بھلا نہیں سکا ہوں''۔ (ص:۲۰۹)

ایم.جی روڈ کیمپ پر جامع مسجد کی لائن میں ہی قدوس صاحب کی گھڑی کی دوکان تھی۔ جوشؔ صاحب کی ان سے دوستی ہوگئی تھی۔ شام کے وقت اکثر احباب کے ساتھ یہاں محفل جمتی۔ اسی دوران پونہ کے جن چند احباب سے جوشؔ کی رسم وراہ ہوئی۔ ان میں محمد فصیح صاحب بھی ایک

تھے۔ جوش لکھتے ہیں کہ ''ان کے گھر اکثر رات مُن نشستیں ہوا کرتیں۔ اسی طرح اچھی خاصی چنڈال چوکڑی کی صورت نکل آئی تھی۔''

قمر علی ٹیلرنگ ماسٹر اور آفتاب حسین لانڈری والے سے بھی جوش کا یارانہ تھا۔ پونہ کے ایک رئیس مولیدینہ سے بھی جوش کا ''تعلقِ خاص'' رہا ہے۔ یادوں کی برات میں لکھتے ہیں:

> ''وہاں (پونہ میں) میرے ایک لکھ پتی دوست اور بھی تھے۔ ''مولا ڈینا'' جو ہمہ وقت شراب پیتے اور لوگوں کی بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ امداد کیا کرتے تھے۔ اور ایک سلسلۂ خاص میں انھوں نے مری اعانت بھی کی تھی۔ جس کو میں فراموش نہیں کر سکوں گا''۔

اختر الایمان نے اپنی سوانح حیات ''اس آباد خرابے میں'' میں بار بار جوش کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ رقمطراز ہیں: ''رامانند ساگر کے گھر (پونہ میں) ایک محفل مجھے یاد ہے جس میں جوش بھی تھے۔ میں نے تیرہ چودہ پیگ پیے تھے۔ دو تین پینے والے اُلٹیاں کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا جوش آہستہ آہستہ پیچھے کو سرکتے جا رہے ہیں اور آخر میں جوتے ہاتھوں میں لے کر باہر آ گئے۔

''کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے ان کے پیچھے آ کر پوچھا۔

''تم سے مطلب؟''

انھوں نے موٹی سی گالی دی۔

''...... یہ لے جاؤ'' اور جوتے ہاتھوں میں تھامے تھامے اسٹیشن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور بھاگتے چلے گئے''۔ (ص: ۱۲۵)

حکیم رازی ادیبی جن دنوں رحیمیہ دواخانے میں تھے تو اکثر انھوں نے جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی کو سینٹر اسٹریٹ پر تفریح کرتے اور لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جوش عموماً چوڑی دار پائجامہ لکھنوی کرتا پہنتے۔ اس لباس میں بہت خوبصورت نظر آتے تھے۔

جوشؔ کے لطیفے

جوشؔ نے ایک مرتبہ پونے میں ایسی سیاہ فام عورت کو دیکھا جو صحیح معنوں میں ''سنگِ موسیٰ'' کا مجسمہ معلوم ہوتی تھے۔ اسے دیکھ کر ایک شعر نازل ہوگیا۔

اے کہ کاکل کی طرح نرم وسیاہ فام ہے تو
چشمِ بدّور کہ خالِ رُخِ ایام ہے تو

شعر سن کی جاں نثار اختر نے کہا: ''آپ کے تحت الشعور میں پہلے سے فیضؔی کا یہ شعر موجود ہوگا۔

اے کہ سر حلقۂ سبزانِ سیاہ فام توئی
چشمِ بدور کہ خالِ رُخِ ایام توئی

آپ نے بے چاری پر مفت کا احسان رکھ دیا''۔

پونے میں ایک شام جوشؔ کے مکان پر جاں نثار اختر اور رشدی بیٹھے پی رہے تھے۔ جوشؔ کی بیگم صاحبہ ان دونوں کے درمیان آکر بیٹھ گئیں۔ باتوں باتوں میں رُشدی نے جو جوشؔ کے بے تکلف دوست تھے بیگم صاحبہ سے شرارتاً دریافت کیا کہ کیا فی الواقع، انوری خانم کو بچانے کے لیے جوشؔ سمندر میں کود پڑے تھے، جیسا انھوں نے اپنی نظم میں لکھا ہے؟ بیگم صاحبہ نے بتایا ''میری موجودگی کی بات ہے ان کا اور انوری کا جھگڑا ہوا۔ وہ روٹھ کر سمندر کے کنارے جا بیٹھی، یہ مجھے چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے گئے اور خوشامد درآمد کر کے اسے منالائے۔ نہ وہ سمندر میں کودی نہ یہ کودے۔ اب شاعری میں جو جی چاہے لکھ دو''۔

ایک محفل میں جوشؔ صاحب نے جاں نثار اختر سے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ جاں نثار اختر نے ایک نظم پڑھی جو مشکل قوافی میں تھی۔ طاؤس، فانوس، ملبوس۔ جس کے آخری دو شعر یہ تھے:

اے دوست تیرے بغیر کیا
یہ نام و نمود و ننگ و ناموس

آ، اتنے قریب آج آجائیں
دھڑکن بھی دلوں کی نہ ہو محسوس

سن کر جوش صاحب کہنے لگے:

''لڑکا بالغ ہوگیا ہے''۔

ڈاکٹر خنداں کے فرزند رشید صاحب سے جب ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا:

''ہمارے مکان واقع بھوانی پیٹھ (بھگوان داس چال کے سامنے) میں ایک مرتبہ شعری نشست چل رہی تھی۔ مقامی شعراء مدعو تھے۔ کسی نے آکر بتایا کہ باہر ایک صاحب کھڑے ہیں۔ میں جب باہر آیا تو بجلی کے کھمبے کے پاس ایک صاحب سفید کرتا اور چوڑی دار پائجامہ پہنے اونچے پر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے جب پوچھا تو کہتے لگے،''میں شاعر ہوں۔ میرا نام جوش ملیح آبادی ہے''۔ پھر میں انھیں نشست میں لے آیا اور انھوں نے اپنا کلام سنایا''۔

☆☆☆

کینیڈا میں سہ روزہ جوش سمینار

اقبال حیدر
کینیڈا

جوش لٹریری سوسائٹی آف کینیڈا نے اگست ۱۵، ۱۶، اور ۱۷ویں کو ایک تین روزہ سمینار یونیورسٹی آف کیلگری کے Dale Carnegie ہال میں منعقد کیا۔ یہ سمینار کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا، اول تو یہ کہ اس سمینار میں نہ صرف گفتگو جوش کے حوالے سے ہوئی بلکہ ایک ذیلی مقصد کے طور پر اردو کے ''مذہبی تشخص'' اور ''اُس کی اصل ساخت، جبلت اور مزاج'' کو بھی زیرِ بحث لایا گیا نیز یہ بھی دیکھا گیا کہ دنیا جو کہ ''انفارمیشن ٹکنالوجی'' کی وجہ سے ایک ''گلوبل ویلیج'' بن چکی ہے، دوسرے انتہائی سرعت اور بڑی تعداد میں انتقال آبادی کی باعث تقریباً ہر ملک اور خطے کی بدلتی ہوئی آبادیاتی ساخت (Demographic Makeup) کا تقاضا یہی ہے کہ حقیقی معنوں میں ہم آہنگی اور رواداری کو اپنایا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ دنیا اور انسانی برادری کی بقا کے لئے اختلاط (Integration) جتنا آج ضروری ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ رہا ہو۔ ظاہر ہے اِس لحاظ سے صرف زبانی اختلاط سے کام نہیں چلے گا بلکہ عملی اختلاط اور رویوں میں واضح اور حقیقی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ تیسرے یہ بھی ہے کہ مذہبی لحاظ سے عدم استحکام (Insecurity) سے پیدا شدہ شدت میں کمی لانے کے لئے ضروری ہے کہ تمام مذاہب کے

لوگ اپنے اپنے مذہب کو کمزور سمجھنے کے بجائے واقعی قوت کا سرچشمہ سمجھیں۔غرض ہر اُس چیز سے پرہیز کریں جو ایک دوسرے پہ تجاوز یا زیادتی کا باعث بنتی ہیں۔ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس خصوصی سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ اِسی لئے اِس میں پہلی بار ''سائنسداں'' حضرات کو دعوت دی گئی کے وہ مندرجہ بالا پس منظر میں ''جوش کے نظریۂ وحدتِ انسانی'' اور ''عقلی تناظر میں پرکھنے کے اصرار'' کو کھنگالیں اور اس قلزم فکر کی وسعت اور گہرائیوں کا اندازہ لگانے کے ساتھ ساتھ ''فی زمانہ'' (Contemporary) سائنسی تحقیق اور ایجادات کی روشنی میں اپنا مطمحِ نظر بیان کریں۔اس کے علاوہ ایک اور کوشش جو بالآخر اس دفعہ بارآور ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ کینیڈا میں پیدا ہونے والی نسل کو اردو، اردو تہذیب اور اردو تہذیب کے مسائل کی طرف راغب کرنا تھا۔اِس سیمینار کا عنوان "Josh-A Visionary Poet" تھا اور ذیلی عنوان تھا "A Conjugation of Art & Science"۔مشرکاء میں ڈاکٹر پرویز ہود بھائی، ڈاکٹر انیس عالم، ڈاکٹر گوہر رضا، جناب عبدالرحمٰن، ڈاکٹر علی کاظمی، ڈاکٹر رضا نقوی، ڈاکٹر عرفان حبیب، ڈاکٹر رفعت انصاری، ڈاکٹر جاوید قریشی، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر وسیم الحق، ڈاکٹر نوید سید، ڈاکٹر روز گولڈسٹین، جناب کرامت غوری، جناب یاور عباس، ڈاکٹر راحت نقوی، جناب علیم غزنوی اور ڈاکٹر سلیم قریشی شامل تھے۔

اِس سمینار کے ناظم اور کھیون ہار جناب یاور عباس تھے جنھوں نے آخر میں اپنا معروف مقالہ اور صوتی شاہکار ''جوش کے دو عشق'' بھی پیش کیا۔اِس مقالے اور مشاعرے کے علاوہ تمام کا تمام پروگرام انگریزی میں تھا۔ یاور عباس صاحب کی شخصیت کے کئی حوالے ہیں، صداکار، براڈ کاسٹر، فلم میکر، دانشور اور محقق۔یاور عباس صاحب نے تمام تر پروگرام کو اپنی شخصیت کے عکس میں ڈھال کر بہت دلچسپ بنا دیا اور مقالہ جات کے درمیان بڑی مہارت سے لوگوں کے انہماک کو قائم رکھا۔کیلگری جیسے دور دراز علاقے میں دو روزہ مقالات کے تواتر کے باوجود لوگ اچھی خاصی تعداد میں شریک ہوئے جن میں بیشتر کا تعلق پاکستان اور ہندوستان سے تھا مگر خاصے لوگ مقامی آبادی سے بھر آئے۔ اِس کے علاوہ دیگر قومیتوں کے لوگوں نے بھی ایک آدھ سیشن میں

شرکت کی۔ نئی نسل کے کم از کم دس سے پندرہ لوگ بھی شریک ہوئے۔

پروگرام کا افتتاح نادیہ کاظمی کے ایک انگریزی گانے سے ہوا۔ نادیہ کاظمی پاکستانی نژاد کنیڈین ہیں اور تعلیمی اعتبار سے وکیل اور تخلیقی لحاظ سے گیت کار اور سنگر ہیں۔ ان کا البم نیو یارک سے آرہا ہے جس میں ان کا یہ گانا بھی شامل ہے "My True Love" اِس گانے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ جوش کی معرکہ آرا نظم ''اکتارا'' سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ اِس گانے کو تمام سامعین نے خاصا پسند کیا۔ اس کے بعد جوش سوسائٹی کے بانی اور صدر اقبال حیدر نے اعجازی خطبۂ استقبالیہ دیا اور کیلگری یونیورسٹی کی ایسوسی ایٹ وائس چانسلر ڈاکٹر روز گولڈسٹین کو مدعو کیا کہ وہ اس سمینار کا با قاعدہ افتتاح کریں۔ ڈاکٹر گولڈسٹین نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں جوش کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور جوش کی فکر جو بذریعہ ترجمہ اُن تک پہنچی تھی اس کو عصری حسیت سے معمور اور مستقبل کی ''پیش بین'' کہا۔

جناب یاور عباس صاحب نے اس کے بعد ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کا تعارف کروایا اور ان کو اپنا خطبہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر ہود بھائی کسی تعارف کے محتاج تو ہیں نہیں اور ان کی فکری نہج سے کون واقف نہیں ہے۔ ڈاکٹر ہود بھائی نے اپنا مقالہ کتاب کے لئے مختص کرتے ہوئے صرف چند امور کی طرف نشاندہی کی جو جوش کی فکر میں مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جوش کو انھوں نے تھوڑا بہت پڑھا تھا لیکن با قاعدہ طور پر اب پڑھنا شروع کیا ہے اور ان کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جوش نے تمام تخریبی اور تفریقی قوتوں سے براءت کا اعلان کیا اور تمام تر مصائب سہنے کے باوجود اپنے موقف پر قائم رہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جوش ایک True Humanist تھے۔ انھوں نے وقت کی تنگی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے جوش کی نظم ''زندانِ مثلث'' کے اقتباس پر اپنی گفتگو کو ختم کیا۔ اس کے بعد ''ناسا'' کے معروف سائنسداں پاکستانی نژاد امریکی جناب ڈاکٹر رفعت انصاری کو دعوت دی گئی جو کسی اچانک مجبوری کی وجہ سے نہ پہنچ سکے مگر انھوں نے اپنا پیپر ''ای میل'' کر دیا تھا جس کو کیلگری کے جناب شکیل احسن نے بڑے احسن طریقے سے سنایا۔ ڈاکٹر انصاری نے بھی جوش کی فکری وسعت اور عقلی رویے کو سراہتے ہوئے

اُنھیں اردو ادب کے بنیاد گذاروں میں شمار کیا۔ ڈاکٹر انصاری کے سائنسی تناظر میں عقل کے حوالے سے کی گئی گفتگو کے بعد جناب ڈاکٹر تقی عابدی، جو ٹورانٹو سے تشریف لائے تھے اور اردو دنیا کی جانی پہچانی شخصیت ہیں کو دعوت دی گئی۔ اُن کا آرٹیکل خالص ادبی نوعیت کا تھا اور انھوں نے ایک طرح سے ''جوش اور خیام'' کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جس کو خاصا پسند کیا گیا۔ ڈاکٹر علی کاظمی، ڈاکٹر انیس عالم اور ڈاکٹر گوہر رضا نے صدارتی کلمات عطا کئے۔ کھانے کے وقفے کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا جس میں ڈاکٹر انیس عالم کا مقالہ انتہائی وقیع اور فکر انگیز تھا مگر اُن کو اس کی تلخیص پیش کرنی پڑی۔ اس مقالے کی کتابی شکل میں اشاعت کے بہت لوگ منتظر ہیں۔ اُن کے نام نامی سے کون واقف نہیں، لاہور سے تشریف لائے تھے اور ہندو پاک لیڈنگ سائنسدانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ایک عرصے تک نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنسداں ڈاکٹر عبدالسلام سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ اُن کے مقالے کا عنوان ہی اس کے تیور ظاہر کر دیتا ہے۔ جوش پر اُن کی گرفت نئی مگر بڑی توانا ہے، "Josh - celebrator of life, Reason & Humanity" ڈاکٹر انیس عالم کے بعد جناب گوہر رضا تشریف لائے اور انھوں نے جوش کی فکر اور شاعری کو ہندوستان کی شخصیت نگاری کے بانیوں میں قرار دیا اور جوش کی انسان دوستی اور مذہب بیزاری کے حوالے سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر گوہر رضا ہندوستان سے تشریف لائے۔ شاعر ہیں، سائنسداں اور فلم میکر ہونے کے ساتھ ساتھ Political Activist ہیں۔ اُن کے بعد ٹورانٹو میں مقیم پاکستان کے سابق سفیر جناب کرامت اللہ غوری نے جوش کے حوالے سے بڑی پُر مغز اور بسیط گفتگو کی۔ اُن کی گفتگو کا عنوان ''جوش ایک ناگزیر متشکک'' تھا اور خاصا سراہا گیا۔

یوں تو تمام ہی مقالے بہت پسند کئے گئے مگر خصوصاً ڈاکٹر جاوید قریشی اور ڈاکٹر نوید سید کے مقالات کو بڑی پذیرائی ملی۔ ڈاکٹر نوید سید کا مقالہ واقعتاً بہت ہی نئے ڈھب سے لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر وسیم الحق جو ایڈمنٹن سے تشریف لائے تھے اور ایک جانے مانے استاد اور بائیوکمسٹری کے سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی تجزیہ نگار اور بائیں بازو کے نظریاتی دانشور ہیں، اپنے مقالے کو کتاب کے لئے مختص کرتے ہوئے ایک جامع تقریر کی اور جوش کے مختلف ادوار کو جانچا

اور سراہا۔ ہندوستان سے تشریف لائے ہوئے صف اول کے وکیل، سماجی کارکن، دانشور اور اردو عالمی ٹرسٹ کے بانی چیرمین جناب عبدالرحمٰن صاحب نے اپنی نامکمل تقریر کو اس وعدے پر ختم کیا کہ وہ اپنے مقالے میں ان تمام سوالوں کا جواب فراہم کریں گے جو انھوں نے خود ہی اپنی گفتگو میں اٹھائے تھے۔ ان کے چند سوالات یقیناً سنجیدگی سے غور طلب ہیں۔ آخر میں ایک مختصر سیشن جناب محمد یامین صاحب کی کاوش سے مختص تھا۔ جناب محمد یامین ریٹائرڈ بینکر اور عمدہ شاعر ہیں جو اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں کہتے ہیں۔ وہ خاصے عرصے سے پرتگال میں مقیم ہیں۔ انھوں نے 2006ء میں جوش کے رباعیات کے مجموعے قطرہ و قلزم کا منظوم ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ اس کتاب کا نام "A drop & the ocean" ہے۔ اس کی اشاعت امریکہ کے مشہور پبلشنگ ادارے ''آتھر ہاؤس'' نے کی تھی اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپ گیا ہے جو کہ یقینی طور پر ایک بڑی خوش آئند بات ہے۔ اقبال حیدر نے ان کا تعارف کرایا اور اُن کی کتاب اور ان کے بارے میں ایک مختصر سی گفتگو کی۔ اس کے بعد یامین صاحب نے سامعین سے خطاب کیا اور اپنے ترجمے پیش کیے جنھیں بے انتہا سراہا گیا۔ شام کا آخری پروگرام ایک مشاعرہ تھا مگر اس سے پیش تر دو نوجوانوں کی بنائی ہوئی جوش کی تصویر پیش کی گئی اور چند بچوں نے جوش کے انگریزی ترجمے کو پڑھ کر اپنے تاثر پیش کیے۔ ندا حیدر کا مضمون جس کو اُن کی غیر موجودگی میں انا کاظمی نے سنایا بہت پسند کیا گیا۔ مشاعرے سے پیش تر یاور عباس صاحب نے اپنا مشہور مقالہ نما صوتی مرقع ''دو عشق'' پیش کیا۔ کیلگری کے مجمع نے ان کو پہلی بار دیکھا اور سنا تھا، وہ تو اُن کے گرویدہ ہو گئے اور ظاہر ہے یاور صاحب نے بھی اس اشتیاق کا حق ادا کر دیا۔ شائستہ رضوی نے مشاعرے کا آغاز کیا۔ کیلگری کے شعراء میں ولی زیدی اور اقبال حیدر نے اپنا مختصر کلام سنایا اور اُس کے بعد جناب گوہر رضا، جناب محمد یامین، جناب جاوید قریشی، جناب اشفاق حسین، جناب یاور عباس، جناب ڈاکٹر نقوی اور نسیم سید صاحبہ نے اپنے کلام سے سامعین کا دل موہ لیا۔ مشاعرے کی صدارت جناب گوہر رضا نے کی اور مہمانِ خصوصی جناب عبدالرحمٰن تھے۔ مشاعرے کے ساتھ ہی دوسرے روز کے پروگرام کا اختتام ہو گیا۔

اِس پورے سیمنار کی کاروائی اور مقالات کو کتابی شکل میں دسمبر ۲۰۰۹ء تک کینڈا سے شائع کیا جائے گا۔ جو صاحبانِ فکر ونظر اِس سلسلے میں انگریزی میں لکھا ہوا کوئی مقالہ ارسال کرنا چاہیں وہ مندرجہ ذیل پتے پر بھیج سکتے ہیں یا e mail کر سکتے ہیں۔ اِس کے علاوہ یہ تمام کاروائی اور پیپرز جوش لٹریری سوسائٹی کی Website پر جلد ہی دیکھے جا سکیں گے۔ دیگر چینلز جن پر اس سیمنار کو Coverage ملا ان میں ARY اردو سروس ٹورانٹو، وائس آف امریکہ، بی بی سی، دوردرشن اور ای ٹی وی شامل ہیں۔ ARY, GeoTV پاکستان، انڈس اور دیگر میڈیا کو پہلے سے ای میل بھیجے گئے اور اطلاع دی گئی مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں موصول ہوا۔

دو روزہ مقالوں، مشاعرے اور کلاسیکل ڈانس کے بعد تیسرے دن کا پروگرام محفلِ غزل پر مبنی تھا۔ ٹورانٹو سے آئے ہوئے مختار ایلیا نے آغاز کیا۔ اس کے بعد شہنشاہِ غزل مہدی حسن خان کے ہونہار فرزندگان کامران حسن اور عمران حسن نے اپنے فن کے جادو سے سامعین کو خوب خوب محظوظ کیا۔ عمران حسن تبلے کے فن میں اب استادی کا درجہ پا چکے ہیں اور ان کے بڑے بھائی جنھوں نے نہ صرف اپنے والد کی گائی ہوئی غزلیں سنائیں بلکہ چند بالکل نئی کمپوزیشن جس میں نظیر اکبر آبادی اور جوش صاحب کی غزلیں اور نظمیں بھی شامل تھیں گا کر لوگوں کو مسحور کر دیا۔ خاص طور سے جوش کی ''گلبدنی'' گا کر تو کامران حسن نے وہ سماں باندھا کہ اس کا تذکرہ اور چرچا ایک عرصے تک رہے گا۔ یہ غزل کی محفل ناہید کاظمی کے گھر پر رکھی گئی تھی اور صبح چار بجے تک چلتی رہی۔ اس محفل میں تقریباً دو سو لوگوں نے شرکت کی۔

☆☆☆

وفیات

گذشتہ دنوں ہمارے درمیان سے کئی اہم شاعر وادیب رخصت ہو گئے۔

نامی انصاری ممتاز بزرگ ترقی پسند شاعر ادیب اور ناقد تھے، زندگی بھر کانپور میں رہے، ملازمت کی، اور بے لوث پڑھنے لکھنے میں مصروف رہے۔ نظریاتی طور پر ترقی پسند تھے لیکن ہر مزاج کا ادب پڑھتے اور ایک رائے رکھتے تھے۔ نوجوانوں کی تحریروں کو بھی محبت سے پڑھتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ کئی اہم کتابیں لکھیں اور ایک طویل علالت کے بعد تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

مخمور سعیدی ممتاز شاعر اور نثر نگار تھے۔ ٹونک کے تہذیبی خاندان سے وابستگی اور استاد شاعر بسمل سعیدی کی شاگردی قدامت اور کلاسیکی تربیت میں رچے بسے مخمور سعیدی بے حد شریف انسان اور عمدہ شاعر تھے۔ زندگی دہلی میں گزاری عمر آخر میں قومی اردو کونسل کے رسالے 'فکر و تحقیق' اور اردو دنیا سے وابستہ رہے۔ ان کی موت سے اردو دنیا ایک معیاری شاعر اور زبان و ادب کے ایک بے لوث خدمت گزار سے محروم ہو گئی۔

۱۹۷۰ کے بعد افسانہ لکھنے والوں میں **شفق** کا نام بے حد نمایاں ہے۔ اک زمانے میں جب علامتی و تجریدی افسانے لکھنے کا زور تھا شفق نے اپنی مخصوص تحریر اور اسلوب کے ذریعہ اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ کئی مجموعہ اور ناول لکھے جو اردو دنیا میں پسند کئے گئے۔ تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

ادارہ ان سب مرحومین کے غم میں سوگوار ہے۔

Josh Bani [4] - A Literary Book Series

سہ روزہ عالمی جوش سمینار کیلگری (کینڈا) کے شرکاء

جوش سمینار میں اقبال حیدر خطبۂ استقبالیہ دیتے ہوئے۔